مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم

سیرت و شخصیت اور علمی و عملی کارنامے

مولانا سعید احمد اکبرآبادی

مرتبہ

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم

سیرت و شخصیت اور علمی و عملی کارنامے

مولانا سعید احمد اکبرآبادی

مرتبہ

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری

یکے از مطبوعات

مولانا سعید احمد اکبرآبادی اکیڈمی

پاکستان

کتاب : مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم (سیرت و شخصیت اور علمی و عملی کارنامے)
مصنّف : مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم
مرتّب : ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری
ناشر : ادارہ تصنیف و تحقیق پاکستان - کراچی ۱۴
طابع : المخزن پرنٹرز (مکتبہ رشیدیہ) پاکستان چوک - کراچی ۱
اشاعت اوّل : دسمبر ۱۹۸۶ء
تعداد اشاعت : ایک ہزار
قیمت : ۲۵ روپے

مولانا سعید احمد اکبر آبادی اکیڈمی - پاکستان
قاری منزل - مرامد اسٹریٹ، پاکستان چوک -
کراچی ۱، فون نمبر ۲۱۳۸۲۴
(اکیڈمی کا یہ پتا عارضی ہے)
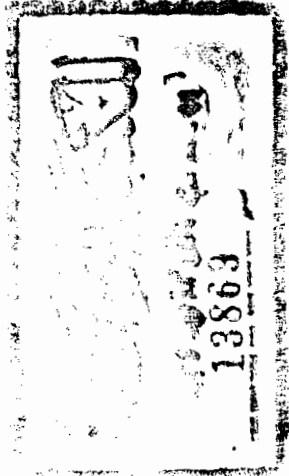
بہ تقریب

صد سالہ یوم پیدائش

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ

وطن آبائی

دہلی مرحوم (پنڈت کا کوچہ)

سلامٌ علیٰ نجدٍ، ومَن حلّ بالنجد

وطن مادری: مدینہ طیبہ

دارم دلے گرداں کہ من قبلہ نمائی خوانمش ——— روسوئے ابرویش کند ہر چند می گردانمش

ولادتِ باسعادت

ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ مطابق اگست ۱۸۸۸ء

بمقام مکہ معظمہ زادہ اللہ شرفاً وکرامۃً، محلہ قدوۃ، متصل باب السلام

بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ

وفاتِ حسرت آیات

۲ شعبان المعظم ۱۳۷۷ھ مطابق ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء بروز ہفتہ

بہ مقام دہلی (دارالحکومت ہند)

آزاد نیشنل کمیٹی، پاکستان

فہرست

تبصرے :

مولانا سعید احمد اکبر آبادی اکیڈمی، پاکستان

مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایک عظیم علمی شخصیت تھے۔ اعلیٰ درجے کے معلّم تھے، ایک علمی خطیب تھے انھوں نے نصف صدی سے زیادہ عرصہ ماہنامہ برہان (دہلی) جیسے علمی رسالے کی ترتیب و تدوین میں گزارا تھا اور یہ کوئی معمولی اعزاز نہ تھا۔ ان کی نظر نہ صرف برصغیر کی علمی، ادبی، تعلیمی، تہذیبی تحریکوں اور اداروں پر بہت گہری تھی بلکہ وہ ایک بلند پایہ سیاسی مبصر بھی تھے۔ ان کے علم کی گہرائی اور مطالعے کی گیرائی بے پناہ تھی۔ وہ اردو زبان کے بلند پایہ ادیب تھے اور عربی، فارسی اور انگریزی زبان سے صرف واقفیت ہی نہ رکھتے تھے بلکہ ان زبانوں کے ادب کے ذوق آشنا تھے۔ وہ ایک بلند پایہ عالم دین تھے اور مختلف اسلامی علوم و فنون، خصوصاً تاریخ، فقہ، تفسیر، حدیث میں ماہرانہ نظر رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں بہت ذہنی و دماغی صلاحیتوں، فکر و نظر کی دولتوں اور اخلاق و سیرت کی رفعتوں سے نوازا تھا۔ وہ ایک کھلے ذہن و دماغ کے مالک اور فراخ حوصلہ انسان تھے۔ انھوں نے اپنے پیچھے مطبوعہ و مرتب اور غیر مرتب بہت بڑا علمی ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔ ان کی بہترین یادگار ان کی وہ اولاد معنوی بھی ہے جو ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں ہزاروں کی تعداد میں، زندگی کے مختلف گوشوں میں اپنے علم و عمل سے انسانیت کی خدمت اور زندگی کی تزئین و تہذیب میں مصروف ہے۔ مولانا نے اپنے ایک وجود سے علم و عمل اور تصنیف و تحقیق کی تحریکات پیدا کی ہیں۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی اکیڈمی، کا قیام ادب و تہذیب کی روایات اور علم و تعلیم اور تصنیف و تحقیق کی تحریکات کے احیاء کے لیے عمل میں آیا ہے۔ اکیڈمی کے پیش نظر تالیف و تدوین، تصنیف و تحقیق اور اشاعتِ علوم و فنون کے جو مقاصد ہیں، وہ حالات اور وسائل کی گنجایش کے مطابق رفتہ رفتہ انجام پائیں گے۔ مستقبل قریب کا جو منصوبہ ہے وہ خود مولانا اکبر آبادی کے رشحاتِ فکر و قلم کی تدوین و اشاعت سے متعلق ہے۔ اس منصوبے کے کاموں کی تقسیم اس طرح ہوئی:

الف: اردو اور عربی، فارسی زبان و ادب سے متعلق مقالات کے مجموعے۔

ب: مذہبی و دینی مباحث پر مولانا مرحوم نے بہت لکھا ہے۔ ان کے مسائل و افکار کی مناسبت سے تین چار یا اس سے زائد مجموعے۔

ج : رسالہ برہان کے اجرا کے وقت سے مولانا نے سیکڑوں شخصیات کی وفات پر جو مقالات قلم بند فرمائے ہیں، وہ اس دور کی ایک اہم علمی اور تہذیبی تاریخ ہے۔ ان تمام مقالات کی ایک یا دو جلدیں۔

د : نظرات کے عنوان سے مولانا برہان میں ملک کے علمی، ادبی، تعلیمی، معاشرتی احوال و سیاسی تحریکوں، اداروں، شخصیات اور واقعات و حوادث کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ یہ سلسلہ ان کی وفات تک جاری رہا۔ مختلف عنوانات کے تحت ان تمام افکار و افادات کی ترتیب و اشاعت بھی اکیڈمی کے پیش نظر ہے۔ یہ ایک اہم علمی، ادبی اور تاریخی ضرورت ہے۔

ھ : گذشتہ نصف صدی میں سیکڑوں کتابوں پر تبصرے بھی مولانا کے قلم سے نکلتے رہے تھے۔ یہ تبصرے مولانا کے افکار کے نمایندہ، ان کے علم و نظر کی گہرائی و گیرائی کا ثبوت اور معلومات کا خزینہ ہیں۔ انھیں بھی ایک یا دو جلدوں میں شائع کرنا۔

و : مولانا نے ملک اور بیرون ملک، دنیا کے کئی ملکوں کے علمی و تعلیمی سفر کیے تھے اور ان اسفار کے حالات و تاثرات کو سفرناموں کی صورت میں لکھ کر برہان میں شائع کرتے رہے تھے۔ یہ سفرنامے اپنی علمی افادیت اور تاریخی و تعلیمی اہمیت رکھتے ہیں۔ اکیڈمی انھیں مرتب کرکے شائع کرے گی۔

پیش نظر یہ ہے کہ کاموں کی تقدیم و تاخیر کا لحاظ کیے بغیر جو کام انجام پاجائے اور اس کے لیے وسائل مہیا ہو جائیں، اسے شائع کر دیا جائے۔ اسی نقطۂ نظر سے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم سے متعلق مولانا اکبرآبادی کے افکار و مطالعہ پر مبنی یہ کتاب شائع کی جا رہی ہے۔

آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ اس کتاب میں مولانا کا مقالہ بھی ہے جو آجکل (دہلی) کے آزاد نمبر میں شائع ہوا تھا۔ مراسلہ بھی ہے جو صدق جدید (لکھنؤ) میں چھپا تھا۔ اس میں مولانا کے فکر انگیز "نظرات" کے نمونے بھی ہیں اور ان کے علم و نظر کا ثبوت ان کے "تبصرے" بھی۔ ایک خطبہ بھی ہے جو مولانا نے لاہور کے ایک سیمینار میں دیا تھا اور حکمت قرآن (لاہور) میں چھپا تھا۔

یہ ایک کتاب یا مجموعہ مضامین مولانا اکبرآبادی کے فکر و فن کے تمام خصائص کا حامل ہے۔ اس سے ان کے علم و نظر کی جامعیت، مطالعہ کی وسعت اور اسلوب نگارش اور طرز بیان کی ندرت کا اندازہ کر لیا جا سکتا ہے۔

امید ہے کہ مولانا سعید احمد اکبرآبادی اکیڈمی[1] کے سلسلۂ مطبوعات کی یہ پہلی کتاب ہندوستان اور پاکستان کے علمی حلقوں میں پسند کی جائے گی۔

ابوسلمان شاہجہان پوری

۳۰ر نومبر ۱۹۸۶ء

---

[1] اکیڈمی کے بارے میں معلومات اور دیگر تفصیلات مولانا مرحوم کی صاحبزادی محترمہ مسعودہ بی بی سے معلوم کرنا چاہیے۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی

مولانا سعید احمد اکبر آبادی کو اللہ تعالیٰ نے بہت سی خوبیوں اور کمالات سے نوازا تھا۔ وہ اپنے علم و فضل، اخلاق و سیرت، جامعیت علم و فن اور علمی و تدریسی خدمات کے لحاظ سے نہ صرف علمائے دیوبند میں بلکہ علمائے عصر میں فائق و ممتاز تھے۔

پیدائش و وطن:

مولانا اکبر آبادی کا آبائی وطن ضلع مراد آباد (یوپی) کا قصبہ بچھراؤں تھا۔ ان کی پیدائش ۱۹۰۸ء میں آگرہ میں ہوئی تھی، جہاں ان کے والد ڈاکٹر ابرار حسن میڈیکل پریکٹس کرتے تھے۔ مولانا اپنے نام کے ساتھ اکبر آبادی کا لاحقہ مولد و منشائے طفولیت اور اولین معہد تعلیمی کی نسبت سے لگاتے تھے۔

تعلیم:

مولانا اکبر آبادی کی تعلیم کا آغاز آگرہ (اکبر آباد) سے ہوا۔ پنجاب یونی ورسٹی سے السنۂ شرقیہ کے امتحان پاس کیے۔ اس سلسلے میں کچھ عرصہ لاہور میں قیام رہا۔ اس قیام کے دوران میں شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوریؒ کے درس قرآن میں شریک ہوئے۔ بعد ازاں انگریزی زبان کی تحصیل کی طرف توجہ کی اور گریجویشن کیا۔ اس کے بعد والد کی خواہش کے مطابق دارالعلوم دیوبند میں داخل ہو گئے، جہاں اس عہد کے نامور علمائے حدیث و فقہ، مشاہیر اساتذائے ادب و فلسفہ و منطق اور اصحاب علوم و فنون جمع تھے۔ یہ مولانا کی بڑی خوش نصیبی تھی کہ انھیں مولانا انور شاہ کاشمیری، مولانا شبیر احمد عثمانی، علامہ محمد ابراہیم بلیاوی، مولانا اعزاز علی، میاں اصغر حسین اور مولانا حسین احمد مدنی جیسے علمائے عصر اور فضلائے دہر کے سامنے

زانوے تلمذ تہ کرنے کا موقع ملا۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد وہ سینٹ اسٹیفنز کالج، دہلی میں داخل ہو گئے، جہاں سے انھوں نے ایم، اے کا امتحان پاس کیا۔ اس طرح انھیں اردو کے علاوہ عربی، فارسی اور انگریزی زبان و ادبیات میں رسوخ اور رفتہ رفتہ تحریر و تقریر میں عبور حاصل ہو گیا۔

درس تدریس:

عملی زندگی کا آغاز دارالعلوم ڈابھیل کے عملۂ تدریس میں شرکت سے ہو چکا تھا لیکن تحصیل علمی اور تکمیل علوم مغربی کے شوق میں یہ سلسلہ جلد ہی منقطع کر دیا اور سینٹ اسٹیفنز کالج میں داخل ہو گئے۔ ایم اے کرنے کے بعد وہ اسی کالج میں استاد مقرر ہو گئے، یہ سلسلہ ۱۹۴۷ء تک دراز رہا۔ ۱۹۴۸ء میں وہ مولانا ابوالکلام آزاد کے ایما پر کلکتہ گئے اور مدرسۂ عالیہ کے پرنسپل کی حیثیت سے کام کا آغاز کیا اور دس گیارہ سال کی جدوجہد سے اس تاریخی مدرسے کو جو ۱۹۴۷ء میں بالکل بند ہو گیا تھا، اور جس کے طلبہ و اساتذہ منتشر ہو گئے تھے، از سرِ نو زندہ کیا اور اسے ملک کا ایک نامور اور مایۂ ناز ادارہ بنا دیا۔
۱۹۵۹ء میں وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تشریف لے گئے، جہاں انھیں سنی دینیات کے شعبے کا صدر اور فیکلٹی آف تھیالوجی کا ڈین مقرر کیا گیا۔ علی گڑھ سے سبک دوشی کے بعد تقریباً چار سال تک ہمدرد، دہلی کے ایک تحقیقی ادارے سے وابستہ رہے۔
علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے تعلق کے دوران میں ایک سال کے لیے وہ میکگل یونی ورسٹی کنیڈا میں چلے گئے اور علی گڑھ سے رٹیائرمنٹ کے بعد ہندوستان کی کالی کٹ یونیورسٹی میں ایک سال کے لیے وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے کام کیا، اس کے بعد علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی نے وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے اپنے ہاں بلا لیا۔
علی گڑھ سے دوسری بار علاحدگی کے بعد دارالعلوم دیوبند نے اپنے اس نامور فرزند کے لیے اس کے ذوق کے مدنظر "شیخ الہند اکادمی" قائم کی اور انھیں اکادمی کا ڈائریکٹر بنا یا۔ اس کے ساتھ دارالعلوم کے منتہی طلبہ اور اساتذہ کو حضرت شاہ ولی اللہ محدث

دہلوی کی انقلابی تصنیف "حجۃ اللہ البالغہ" کا درس بھی دیتے تھے۔

مولانا اکبر آبادی نے متعدد تبلیغی اسفار کے علاوہ دنیا کے مختلف ممالک کے علمی سفر بھی کیے، وہ بیسیوں عالمی کانفرنسوں میں شریک ہوئے اور سیکڑوں مباحثوں اور مذاکروں میں حصہ لیا۔

تصنیف و تالیف:

مولانا اکبر آبادی کی پوری زندگی درس و تدریس میں بسر ہوئی۔ ان کی تعلیم و تربیت سے ہزارہا نوجوان علمی و عملی زندگی کے مختلف میدانوں میں کامیابی کے ساتھ گامزن ہوئے۔ لیکن ان کے ذہنی و فکری کمالات کا سب سے بڑا اظہار تصنیف و تالیف کے میدان میں ہوا ہے۔ یہ ذوق ان میں درس و تدریس کی زندگی کے آغاز ہی سے نشوونما پانے لگا تھا۔ درس و تدریس کی مصروفیات کے ساتھ وہ تصنیف و تالیف کے کاموں میں ہمیشہ مصروف رہے۔ انھوں نے ایک درجن سے زیادہ بلند پایہ علمی و تحقیقی تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں۔ ان میں سے صدیق اکبرؓ، عثمان ذوالنورینؓ، غلامان اسلام، اسلام میں غلامی کی حقیقت، مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے ناقد، مسلمانوں کا عروج و زوال، وحی الٰہی، فہم قرآن، خطباتِ اقبال پر ایک نظر، ہندوستان کی شرعی حیثیت بہت مشہور رہیں۔

ندوۃ المصنفین اور برہان، دہلی:

دارالعلوم دیوبند اور اس کے اکابر نے ہر دور اور علم و عمل کے ہر دائرے میں عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں، لیکن اس کی منظم علمی دعوت اور تحریک کا نام ہے "دارالمصنفین، دہلی"۔ اس ادارے کے قیام اور تحریک کو منظم کرنے میں مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے ساتھ مولانا سعید احمد اکبر آبادی روزِ اوّل سے شریک تھے۔ ندوۃ المصنفین کے ذریعے تصنیف و تحقیق اور علم و تحقیق کی دعوت کو پھیلانے اور تحریک کو آگے بڑھانے میں مولانا اکبر آبادی کا حصہ نہایت وقیع ہے۔

ماہنامہ برہان، ندوۃ المصنفین کا علمی ترجمان ہے جو ۱۹۳۸ء میں ندوۃ المصنفین کے قیام کے ساتھ ہی جاری ہوا تھا، مولانا اکبرآبادی شروع ہی سے اس کے مدیر تھے اور اپنے انتقال تک وہ اس ذمہ داری کو بحسن وخوبی انجام دیتے رہے۔"نظرات" کے عنوان سے وہ اس میں ہر ماہ کسی اہم قومی، ملی، علمی، تہذیبی، ثقافتی مسئلے یا کسی قومی حادثے یا کسی نامور شخصیت کے انتقال پر اظہارِ خیال کرتے تھے۔ مولانا ے مرحوم کے قلم سے برہان کے نظرات کئی ہزار صفحات میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ نظرات مولانا کے مطالعہ ومشاہدہ، نظر وبصیرت، باریک بینی اور ژرف نگاہی، تبحر علمی اور وسعت مطالعہ اور فکر وانداز فکر کے ترجمان اور ان کے اسلوب تحریر کے شاہکار ہیں۔ ان کی تالیف وتدوین سے نہ صرف حضرت مولانا ے اکبرآبادی کی خدمات جلیلہ کا ایک روشن باب مرتب ہوجائے گا بلکہ تاریخ ہند پاکستان کے اس ہنگامہ خیز دور میں قومی وملی تاریخ کے اہم ترین پہلوؤں، تحریکوں، حادثوں، واقعوں اور تعلیمی، ثقافتی، سیاسی مسائل وافکار پر مستند ترین مواد مہیا اور مرتب ہوجائے گا۔

برہان اور دیگر علمی جرائد میں ان کے سیکڑوں بلند پایہ مقالات ہیں، جن کی ترتیب وتدوین وقت کی اہم علمی ضرورت ہے۔

سیرت:

مولانا سعید احمد اکبرآبادی بلند پایہ عالم دین، مفکر، ادیب، مصنف، محقق، مدرس اور علمی خطیب تھے۔ ان کے مطالعے کی طرح ان کا قلب بھی بہت وسیع تھا، وہ اخلاق وتواضع کا مجسمہ اور رواداری کی مثال تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں علم کے ساتھ عمل اور عمل میں اخلاص وتقویٰ کی خوبیوں سے نوازا تھا۔

مسلک:

وہ اگرچہ دیوبند کے نظامِ فکر سے تعلق رکھتے تھے، لیکن مذہبی تقشف کی طرح گروہی تعصبات سے بلند اور پاک تھے۔ سیاسیات میں بھی دیوبند کی انقلابی جماعت کے پیرو

تھے اور ہمیشہ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے شریک وسہیم رہے، لیکن ان کا ذوق سیاسی وعملی سے زیادہ علمی وفکری رہا۔

انتقال :

افسوس کہ دارالعلوم دیوبند کا یہ نامور فرزند جو اپنے اسلاف کرام کا علم وفضل اور اخلاق وسیرت میں سچا جانشین تھا، اور آخر دم تک اس کی علمی ودینی روایات کو زندہ رکھنے اور آگے بڑھانے میں ہمہ تن مصروف رہا تھا، ۲۴ مئی ۱۹۸۵ء کو کراچی میں جان ہار ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

مولانا آزاد اور مولانا اکبر آبادی

مولانا سعید احمد اکبر آبادی علماے دیوبند کی اس جماعتِ مخلصین سے تعلق رکھتے تھے جو مولانا ابوالکلام آزاد کے علم وفضل کی معترف، ان کے افکارِ ملّی وسیاسی کی قائل، ان کی علمی ودینی خدمات کی معترف اور ان کی سیرت کے محاسن کی گرویدہ تھی۔

مولانا اکبر آبادی نے اپنی بے شمار تحریروں، تقریروں میں اور مولانا آزاد کی تصنیفات اور مولانا سے متعلق کتابوں پر تبصروں میں مولانا کا بہت محبت اور عقیدت سے ذکر کیا ہے۔ ان کی چند تحریریں تو حضرت مولانا ہی کے تذکرۂ محاسن کے لیے وقف ہیں۔ اس مجموعے میں مولانا اکبر آبادی کی چند ایسی ہی تحریروں اور ایک خطاب کو مرتب کر دیا گیا ہے۔

مولانا کے "خطاب" میں چند باتیں تاریخی لحاظ سے درست نہ آئیں۔ یہ باتیں یا تو مولانا ہی کی زبان سے تقریر کی روانی میں اسی طرح نکل گئیں یا مرتب کے قلم سے ان کی تالیف میں کوتاہی ہوئی۔ چونکہ یہ باتیں بالکل ہی خلاف واقعہ تھیں، اس لیے ان کی تصحیح متن ہی میں کر دی گئی ہے۔ یہاں ان کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے:

۱۔ حضرت شیخ الہند کی انقلابی جماعت کے ارکان کی ایک شخصیت "مولانا سیف الرحمٰن" تھے، نہ کہ سیف اللہ (صفحہ ...)

۲۔ مولانا آزاد کے ایک رسالے یا خطبے کا عنوان "مسئلہ خلافت" ہے نہ کہ منصب خلافت (صفحہ)

۳۔ مولانا آزاد کی ذاتی، زیرِ مطالعہ کتابوں پر ان کے قلمی حواشی مرتب کیے گئے ہیں لیکن وہ تمام نہیں چھپے، صرف چند قسطیں شائع ہوئی ہیں اور وہ بھی سہ ماہی "اسلام اور عصر جدید" دہلی میں، نہ کہ ماہنامہ جامعہ، دہلی میں (صفحہ)۔

۴۔ مولانا آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن، اٹھارہ پاروں کے ترجمہ و حواشی پر مشتمل ہے، نہ کہ بیس پاروں کے ترجمہ و حواشی پر (صفحہ)

ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی کے ایڈیشن میں سورۂ نور کا ترجمہ بھی شامل ہے۔

۵۔ حضرت شیخ الہند کے مطالعے میں الہلال آیا تھا، البلاغ نہیں، البلاغ نومبر ۱۹۱۵ء میں نکلا تھا اور حضرت اپنے منصوبے کے مطابق، اس سے قبل انقلابی سفر پر روانہ ہو چکے تھے۔ اوائل اپریل ۱۹۱۶ء میں البلاغ بند ہو گیا۔ حضرت اس وقت حجاز میں تھے۔ اس لیے یقین ہے کہ البلاغ حضرت کی نظر سے نہ گزرا ہوگا۔ (صفحہ)

۶۔ صحافت کے میدان میں مولانا آزاد نے تیرہ برس کی عمر میں قدم رکھا تھا، نہ کہ سولہ برس کی عمر میں (صفحہ) جنوری ۱۹۰۱ء میں ان کی ادارت میں ہفتہ وار "المصباح"، کلکتہ سے نکلا تھا۔ مارچ ۱۹۰۲ء میں ماہوار "احسن الاخبار"، اسی سال "تحفۂ احمدیہ"، اس سے اگلے سال ۱۹۰۳ء میں "خدنگ نظر"، لکھنؤ (کا حصۂ مضامین)، انھی دو برسوں (۱۹۰۲-۳ء) کی مدت میں کسی وقت "ایڈورڈ گزٹ" شاہجہان پور وغیرہ کے معاون مدیر، نائب مدیر، مہمان مدیر (وقتی مدیر) یا پورے مدیر یعنی مدیر مسئول رہ چکے تھے۔ اور جب کہ ان کی عمر پندرہ برس کی تھی وہ ایک علمی، ادبی ماہوار مجلے "لسان الصدق" کے مدیر تھے۔ سولہ سال کی عمر میں ان کی صحافتی زندگی کا آغاز نہ ہوا تھا بلکہ وہ صحافتی تجربے کا ایک دور گزار چکے تھے اور ادیب اور صحافی کے طور پر ان کی حیثیت مسلم ہو چکی تھی۔

۷۔ مولانا آزاد کے ذوق علمی کے سلسلے میں جہاں "قانون مسعودی" کے مخطوطے کا ذکر آیا ہے (صفحہ ۳۴۳) وہاں مولانا اکبر آبادی نے جو روایت بیان کی ہے، اس میں اور

مولانا آزاد کے بیان کردہ واقعے کی جزئیات میں کچھ فرق ہے۔ اس مقام پر حقیقت حال کی وضاحت کے لیے "البیرونی اور جغرافیۂ عالم" (پاکستانی ایڈیشن) میں ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری کے مقدمے سے مولانا آزاد کا بیان کردہ واقعہ نقل کر کے حواشی میں شامل کر دیا ہے۔

مولانا اکبر آبادی کا یہ خطاب، جو انھوں نے انجمن خدام القرآن، لاہور کے زیر اہتمام "محاضرات قرآنی" میں فرمایا تھا تحریری نہ تھا، اس لیے اس میں مولانا کے اسلوب تحریر کی جستجو نہ کرنی چاہیے۔ انھوں نے مولانا آزاد کی شخصیت، سیرت، علم وفضل اور خدمات کے جن پہلوؤں پر اظہار خیال فرمایا، اگر وہ انھی موضوعات پر قلم اٹھاتے تو تحریر کے دوران میں انھیں مولانا آزاد کے بعض روّیوں اور اپنی بعض رایوں کے بارے میں غور وفکر کا موقع ملتا اور ان کا اظہار اس طرح نہ ہوتا۔ اس صورت میں ان کے کسی نیاز مند کے لیے بھی وہ سب کچھ کہنے کا موقع نہ باقی رہتا، جو بعض حواشی میں کہا گیا ہے، نیز مولانا کے اسلوبِ تحریر کا ایک گلستان آراستہ ہو جاتا۔

مولانا کے اکبر آبادی کے اس خطاب کے نقل واقتباس کے لیے ہم مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور اور اس کے ترجمان "حکمت قرآن" کے شکر گزار ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد

(صد سالہ یوم پیدائش)

مولانا ابوالکلام آزاد غیر معمولی ذہن و دماغ کے انسان تھے۔ وہ اپنے علم و فضل، اخلاق و سیرت اور وضع و تہذیب کی بنا پر مسلم ہندوستان کی ایک ممتاز شخصیت تھے۔ انھوں نے اپنے ذوق و نظر کے مطابق علم و عمل کے مختلف میدانوں میں متعدد علوم و فنون اور ملک و ملت کی بیش از بیش خدمات انجام دی تھیں۔ ان کے علم و نظر کے کمالات، اخلاق و سیرت کے خصائص اور خدمات کی جلالتِ قدر نے انھیں دنیا کے عظیم انسانوں کی صف میں لا کھڑا کیا تھا۔ ان کی عظمت کا تقاضا ہے کہ اس کی تحسین کی جائے اور ان کے حضور سرِ تسلیم و اعتراف جھکا دیا جائے۔

مولانا آزاد نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ایک صحافی کی حیثیت سے کیا تھا اور اگرچہ المصباح اور نیرنگ عالم کے نام سے دو گلدستے نکال چکے تھے، لیکن تاریخی اعتبار سے اس دور میں لسان الصدق لائق اعتنا ہے۔ نومبر ۱۹۰۳ء سے مئی ۱۹۰۵ء تک اس کے صرف دس پرچے نکلے تھے لیکن اس کے مقاصد کی اہمیت کے اعتراف سے اس وقت کی صحافت کی پوری دنیا گونج اٹھی تھی، اس کے مضامین کی افادیت، اسلوب کی دل ربائی اور ترتیب و تہذیب کے حسن نے وقت کے تمام اہل ذوق کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ لسان الصدق کے اجراء سے مولانا کے پیش نظر زبان و ادب اور تنقید میں ذوق کی تسکین و تربیت اور معاشرتی اصلاح کے مقاصد کا حصول تھا۔ ان مقاصد کا ہر جزء جس طرح اس وقت لائق توجہ تھا، اسی طرح آج بھی ان کی اہمیت اور افادیت مسلّم ہے۔

ہمیں چاہیے کہ ماضی کے ہر خادمِ زبان و ادب، نقاد اور عازمِ اصلاحِ معاشرت کی خدمات کا اعتراف اور اپنے عہد کے ہر خادم و مصلح کی تحسین کریں۔

اسی ذوق نے مولانا آزاد کی رہنمائی الندوہ تک کی تھی۔ الندوہ ملک کے ایک تعلیمی ادارے کا ترجمان تھا اور لسان الصدق کے مقاصد کے مقابلے میں اس میں زبان و ادب کا ایک خاص تصور اور معیار تھا۔ بلاشبہ الندوہ میں ادب کا دائرہ وسیع اور علوم و فنون کی تمام شاخوں تک پھیلا ہوا تھا۔ مسلمانوں کی تعلیم اور ان کی ترقی کے مقاصد اس پر مستزاد تھے۔ اگرچہ لکھنؤ میں مولانا کا قیام پانچ چھ ماہ سے زیادہ نہ رہا، اور وہ اس دائرہ فن اور معہدِ علمی سے جلد ہی نکل گئے، لیکن اپنے ذوق و معیار کو دوسروں کے لیے نمونہ چھوڑ گئے۔

مولانا کے اس دورِ خدمت کو نظر انداز نہ کر دینا چاہیے بلکہ اعتراف و تحسین کی ایک نظر اس پر ڈال لینا خود ہمارے ذوق و اخلاق کا ثبوت ہوگا۔

مولانا لکھنؤ سے نکلے اور بمبی اور لاہور ہوتے ہوئے امرت سر جا پہنچے۔ الندوہ چھوٹا تھا اور وکیل کی زمام ادارت ہاتھ میں لی تھی۔ الندوہ ماہنامہ تھا۔ وکیل ہفتے میں تین بار نکلتا تھا۔ الندوہ صرف ایک علمی رسالہ تھا، وکیل ایک مکمل اخبار تھا۔ الندوہ کی فضا محدود تھی وکیل میں مضامین و موضوعات کی کوئی حد قائم نہ تھی۔ وکیل میں مولانا کو ہر قسم کی مضمون نگاری کا موقع ملا اور ہر موضوع پر طبع آزمائی کی۔ وکیل کی اشاعت باقاعدہ ہوگئی، صفحات محدود تھے، اضافہ کیا گیا۔ مولانا کی محنت و مہارت رنگ لائی، اس کی شہرت ملک کے کونے کونے میں جا پہنچی، مقبولیت آسمان سے باتیں کرنے لگی اور اشاعت سیکڑوں سے ہزاروں میں بدل گئی۔ وکیل میں رہ کر مولانا کا ذہن پوری طرح کھل چکا تھا۔ قلم رواں ہو چکا تھا، اور وقت کے مسائل میں مولانا کے شعور نے پختگی حاصل کر لی تھی۔ وکیل مولانا کے صحافتی تربیتی دور کا آخری صحیفہ تھا۔

وکیل میں مولانا کی ادارت کے دو دور ہیں۔ پہلا دور مئی ۱۹۰۶ء سے نومبر ۱۹۰۶ء تک، دوسرا دور وسط ۱۹۰۷ء کے بعد سے جولائی ۱۹۰۸ء تک نو دس مہینے۔ دسمبر ۱۹۰۶ء میں وہ کلکتہ چلے گئے تھے۔ جنوری ۱۹۰۷ء میں انھوں نے "دارالسلطنت" کلکتہ سے جاری کیا۔ لیکن وہ ایک شعلہ مستعجل ثابت ہوا۔ بہ مشکل دو تین ماہ زندہ رہا۔ وسط ۱۹۰۷ء میں مولانا پھر وکیل میں چلے گئے، اور تقریباً آخر جولائی ۱۹۰۸ء تک وہاں رہے۔ پھر بھوپال ہوتے ہوئے والد

کے اصرار پر کلکتہ چلے گئے۔ اگست ۱۹۰۸ء میں مولانا کے والد خیرالدین کا انتقال ہوا، اور اس کے ساتھ ہی مولانا کی زندگی کا بھی ایک دور ختم ہو گیا۔

لسان الصدق کے اجراء کے وقت مولانا کے پیش نظر زبان و ادب اور اصلاح معاشرہ کے جو مقاصد تھے اور الندوہ کی نائب ادارت کے زمانے میں اسلامی تہذیب و تمدن، علوم و فنون اور تعلیم و ترقی کی جن ضرورتوں کو ان کے ذہن و دماغ نے محسوس کیا تھا اور جذبات ملی و قومی کے جو میدان نمایاں ہوئے تھے ان میں فتوحات کے لیے موثر ترین ذریعہ وکیل ہی بنا تھا۔

تاریخ صحافت میں وکیل کا جو نمایاں مقام ہے، اس کی تعمیر میں مولانا کا حصہ قابل قدر ہے۔ وکیل نے ملک و قوم کی جو ہمہ جہت اور زندگی کے مختلف گوشوں میں خدمات انجام دی ہیں اس کی تحسین میں مولانا آزاد بھی شریک ہیں۔ آیندہ مولانا کی زندگی کا ایک مہتم بالشان دور شروع ہوگا۔ لیکن ہمیں اس مقام پر وکیل کے ذریعے مولانا آزاد کی خدمات قومی و ملی اور علمی، ادبی اور صحافتی خدمات کا اعتراف کرنا چاہیے۔

وکیل کی ادارت کے دوسرے دور میں مولانا آزاد کو احساس ہوا کہ ملک میں اصلاح و بیداری کے لیے کوئی تحریک اس وقت تک پیدا نہیں کی جا سکتی، جب تک ایڈیٹر کا قلم اخبار کے مالک کی مداخلت کے خطرے سے پوری طرح مطمئن نہ ہو۔ ملک کی آزادی اور ملک و قوم کی اصلاح و بہبود کی ہر تحریک کے آغاز، ترقی و فروغ اور انقلابی افکار کی تخم ریزی کے لیے سب سے پہلے ایڈیٹر کے قلم کو ہر قسم کے مصالح سے بے نیاز اور مدافعت اور پکڑے جانے کے ہر قسم کے خدشات و خطرات سے بے پروا ہونا چاہیے۔ لیکن یہ بات اس کے بغیر ممکن نہ تھی کہ اخبار کی ادارت ہی نہیں ملکیت کی زمام بھی ایک ہی ہاتھ میں ہو۔

جولائی ۱۹۱۲ء میں الہلال کا اجرا اسی اندازِ فکر کی کارفرمائی کا نتیجہ تھا۔ الہلال قوم و ملت کی ذہنی و فکری تربیت اور زبان و ادب، علوم و فنون، مذہب و سیاست کے تمام میدانوں اور ملک و قوم کی اصلاح و ترقی کے تمام کاموں میں رہنمائی کا داعی اور فکر و عمل میں انقلاب و تغیر کا خواہاں تھا۔ الہلال کی یہ دعوت صرف اخبار کے صفحات اور اس کے سواد

تحریر تک نہ رہی تھی بلکہ اس کی دعوت نے مسلمانوں کے فکر و عمل میں ایک انقلاب پیدا کر دیا تھا، اس نے مسلمانوں کے اندازِ فکر کو بدل کر اسلامی زندگی کے آداب و اطوار کا جویا بنا دیا تھا اور عمل کا ذوق پیدا کر دیا تھا۔ الہلال ہر طرح انقلاب و تغیر کے ایک نئے عہد کا عنوان ہے۔ الہلال کی خدمات کا دائرہ ادب، مذہب، سیاست، صحافت، علوم و فنون کے بے شمار میدانوں اور قوم و ملت کی ذہنی و فکری اور علمی و عملی زندگی کے تمام گوشوں تک پھیلا ہوا ہے۔

الہلال نے قومی و ملی زندگی کے زوال کا احساس دلایا، سیاسی شعور پیدا کیا اور شاہراہِ عمل کی طرف رہنمائی بھی کی۔ الہلال ایک ملی صور تھا جس نے قوم کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا، اس میں روح عمل پیدا کی اور ایثار و قربانی کے جذبات صادقہ سے اس کے قلب کو گرمایا اور زندگی کے میدانوں میں سرگرم عمل کر دیا۔ الہلال اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور ملت کے احیاء کی ایک دعوت تھا، اور اس نے اپنے مقاصد کے دائرے میں مسلمہ طور پر بیش بہا خدمات انجام دیں۔

اس دور میں مسلمانوں کی اصلاح و سربلندی، ملت کے قیام، اسلام کے احیا، تعلیم کے فروغ، علوم و فنون کی ترقی، علمی تحقیق، ادب و تنقید کے ذوق کی تربیت، زبان و ادب کی خدمت، تعلیم و صحافت میں مقاصد و معیار کی جستجو کی جو تحریکیں پیدا ہوئیں اور سیاسی شعور اور بیداری کا جو نیا دور شروع ہوا۔ نیز قوم و ملت کی راہ میں ایثار و قربانی میں جو سرگرمی اور جوشِ عمل پیدا ہوا، اس میں الہلال اور مولانا آزاد کی فکر انگیز تحریروں اور ایمان افروز افکار کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اور اگرچہ تاریخ و واقعات کی یہ صداقت ہمارے اعتراف و تحسین کی ہرگز محتاج نہیں لیکن ہمارے قلب کی شرافت، علم کی دیانت اور سچائی کے ذوق کا تقاضا یہی ہے کہ ہم ان صداقتوں کا اعتراف ضرور کریں، اور حیاتِ قومی و ملی کی تلاش و قیام میں الہلال اور مولانا آزاد کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کریں۔

مولانا آزاد اپنے عہد کے ایک بلند پایہ خطیب بھی تھے۔ انھوں نے خطابت کو ایک نیا رنگ و آہنگ عطا کیا اور اس میں معنویت پیدا کی۔ مجرد خطیب ہونا بھی ایک خوبی ہے اور

خوبی کا تقاضا ہے کہ اس کا اعتراف کیا جائے لیکن مولانا نے تو اپنی خطابت سے قوم کی بیداری، سیاسی شعور کی تربیت، ملت کی اصلاح اور جماعتی زندگی کے قیام کا کام لیا ہے۔ خطابت کو انھوں نے اپنی دعوتِ ملی کے فروغ و اشاعت کا ذریعہ بنایا ہے۔ قوم میں سرفروشی کا جذبہ اور اسلامی زندگی کا ذوق پیدا کرنے میں اس سے کام لیا ہے۔

پس ضروری ہے کہ مولانا کی خطابت کی خوبی کے اعتراف کے ساتھ مولانا کی خدمتِ وطن اور احیائے قوم و ملت اور تحریکِ آزادی میں اس اہم ذریعۂ خدمت کے لیے مولانا آزاد کی بارگاہِ عظمت میں تسلیم و نیاز کا سر جھکایا جائے۔

مولانا آزاد کو اللہ تعالیٰ نے فکر و نظر کی دولت کے ساتھ تصنیف و تالیف اور تحقیق کی بے پناہ صلاحیتوں سے بھی نوازا تھا۔ انھوں نے متعدد تصنیفات اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔

ان کا سب سے پہلے ایک اہم رسالہ جامع الشواہد شائع ہوا۔ یہ غیر مسلموں کے مسجد میں داخلے کے موضوع پر ہے۔ اگر غیر مسلم مسجد میں آئیں اور اس سے دعوت اسلام اور تبلیغ واشاعت دین کے مقاصد کی تکمیل میں مدد ملے تو ان کے مسجد میں داخلے کی ممانعت نہ ہونی چاہیے، مولانا کے اس مختصر رسالے نے ایک اہم دینی مسئلے میں مسلمانوں کی رہنمائی کی۔ اس کے مطالعے سے حدیث و فقہ میں مولانا کے علمی تبحر کا اندازہ ہوتا ہے۔

"تذکرہ" تاریخ عزیمت دعوت کی ایک اہم تصنیف ہے۔ یہ اپنے موضوع پر پہلی تصنیف تھی۔ اس سے دین کا حقیقی فہم اور سچائی کی راہ میں استقامت و ایثار و قربانی کا بے پایاں جذبہ پیدا ہوا۔ مقامِ دعوت اور عزیمت کا شعور پیدا ہوا، اور رخصت کے مقام کے جواز کے ساتھ اس کی پستی کا احساس قلب میں جاگزیں ہوا۔ تاریخ اسلام کی صداقتوں اور مقام دعوت کی پہنائیوں اور دل ربائیوں کی ایسی دلاویز سرگزشت کسی زبان میں کہاں موجود ہے۔ زبان و بیان کی معجز نمائیوں اور اسلوب نگارش کی کرشمہ سازیوں کا عالم اس پر مستزاد ہے۔

مسئلہ خلافت۔ بنگال کی صوبائی خلافت کانفرنس کا خطبۂ صدارت ہے۔ لیکن عام تصور کے مطابق خطبہ صدارت کہاں، اپنے موضوع پر ایک جامع الاطراف علمی، تحقیقی اور نہایت فکر انگیز تصنیف ہے۔ خلافت کے معنی، اس کی تاریخ قیام، اس کی اہمیت، جزیرۃ العرب

کے حدود کا تعین اور غیر مسلم اثرات سے اسے پاک رکھنے کی حکمت، "الائمۃ من القریش" کی حقیقت، مسلمانوں کے اجتماع و اتحاد میں ادارۂ خلافت کی کارفرمائی، خلافت اور ترکی، تحریک خلافت کا پس منظر، مسلمانوں کے فرائض دینی و ملی، اور ان کی بجا آوری کی اہمیت، ضرورت اور طریق عمل اور اس کے ساتھ بے شمار ذیلی و ضمنی مباحث پر مشتمل مولانا آزاد کی یہ ایک نادر الوجود تصنیف ہے۔ مولانا غلام رسول مہر کے بقول اردو، عربی، فارسی، انگریزی، کسی زبان میں اس کی کوئی مثال موجود نہیں۔ ۱۹۲۰ء ـ ۲۱ء کی تحریک خلافت میں تمام افکار کا سرچشمہ یہی ایک تصنیف تھی۔ اردو، انگریزی میں جتنا لٹریچر بھی اس وقت سامنے آیا تھا اس میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس کی طرف رہنمائی اس تصنیف میں نہ کی گئی ہو۔ اس کے مطالعے سے قرآن، حدیث، فقہ اور تاریخ اسلام میں مولانا کے علم و نظر کی گہرائی اور گیرائی کا نقش بھی دل پر ثبت ہو جاتا ہے۔

۱۹۲۱ء میں ترک موالات کی تحریک کے سلسلے میں مولانا کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان پر بغاوت کے مجرم کی حیثیت میں مقدمہ چلایا گیا۔ اس موقع پر مولانا نے عدالت میں جو بیان دیا تھا وہ "قولِ فیصل" کے نام سے بیسیوں دفعہ چھپ چکا ہے۔ یہ بیان تحریک آزادی پاک و ہند اور تاریخ عزیمتِ دعوت کی ایک حیرت انگیز سرگزشت ہے۔ اس مختصر بیان میں مولانا کے ولولہ انگیز اسلوب خطابت، پرجوش طرزِ نگارش اور برٹش استعمار کے خلاف دلائل کی محکمی، فکر کی بلندی، سیرت کی پختگی اور بے مثال جرأت و استقامتِ حق کے جو مظاہر سامنے آئے ہیں، ان کی مثال پاک و ہند کے سیاسی لٹریچر میں تو کیا دنیا کے انقلابی لٹریچر میں بھی شاذ کے درجے میں ہو سکتی ہے۔ اس پر مولانا کے ذہنی و دماغی کمالات، علم و نظر کی وسعتوں اور قرآنی تعلیمات اور تاریخِ اسلام میں ان کے عبور کا تو عالم ہی دوسرا نظر آتا ہے۔

پاکستان اور ہندوستان کی سیاسی تاریخ اور اردو ادبیات کے نظر و مطالعہ کا کوئی مدعی اور مولانا آزاد کی سیرت کے مطالعے کا کوئی شائق، اگر وہ اپنے ولولے اور شوق میں سچا ہے تو لازم ہے کہ اس نے "قولِ فیصل" کو ایک بار سے زائد پڑھا ہو۔ سلسلۂ تاریخِ سیاسیات و

ادبیات کی ایک ناگزیر کڑی کو کوئی شائق علم کیوں کر نظر انداز کر سکتا ہے؟

مسلمانوں نے قرآن حکیم کے ترجمے اور تفسیریں بہت لکھیں۔ ہر ترجمہ و تفسیر میں مترجم اور مفسر کا ذوق جھلکتا ہے یا اس کے نقطۂ نظر کے مطابق مسلمانوں کی تعلیم و اصلاح کی کوئی ضرورت پوری ہوتی ہے۔ یہ سب ضروری کام تھے جو انجام پائے لیکن یہ ذوق و ضرورت کے مختلف گوشے تھے اور یہ سب کام مل کر بھی قرآن حکیم کی تعلیم و اشاعت اور تعمیر انسانیت کی عالمی ضرورتوں کو پورا کرنے سے قاصر تھے۔ مولانا آزاد کے پیش نظر ایک جامع مقصد تھا۔ ان کا ترجمہ و حواشی اور تفسیر فرد کی اصلاح و تربیت، خاندان و معاشرتِ صحیحہ کے قیام، مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے لیے اسلامی بنیادوں کی فراہمی سے لے کر قرآن کے بین الاقوامی پیغام، عالمی انسانی معاشرے کے قیام، تعمیر و فلاحِ انسانیت اور امنِ عالم کی ضرورتوں کے اہم ترین نکات اور مقاصد و ضرورت کے ایک ایک جزء پر محیط ہے۔

دوسروں نے اپنے ذوق و افکار کی ترجمانی کا کام قرآن سے لیا، مولانا نے قرآن کی ترجمانی کا کام اپنے اعلیٰ ذوق اور تصنیف و تالیف کی بہترین صلاحیتوں سے انجام دیا۔ دوسروں کے تراجم و تفاسیر ان کے ذوق و فکر کے ترجمان ہیں، مولانا قرآن کے ترجمان ہیں۔

ترجمان القرآن کے مقاصد کی جامعیت کے ساتھ ترجمہ و تفسیر کی زبان، اسلوبِ بیان و طرزِ نگارش کے حسن کا الگ ایک عالم ہے۔ قرآن کی دعوت اور تعلیم و ارشاد کی دل ربائیوں کے ساتھ بعض مسائل میں ان کی تحقیق کے معیار اور نقد و نظر کے درجہ و اسلوب میں ان کے قلم کی ندرت کاریوں، ذہن کی رسائیوں اور قلبِ سلیم کی لطافت انگیزیوں میں ترجمان القرآن اردو زبان کی ایک نادر اور شاہ کار تصنیف ہے۔

غبارِ خاطر، کاروانِ خیال، نقشِ آزاد، تبرکاتِ آزاد، مکاتیب ابوالکلام آزاد وغیرہ ان کے خطوط کے مجموعے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان میں مولانا کے فکر کا پیمانہ بلند نہیں، اور زبان و بیان اور انشاء و اسلوب کی کون سی خوبی ہے جو ان میں موجود نہیں یا مذہب، سیاست، تاریخ، تعلیم، اصلاح و ارشاد کے موتیوں اور تعمیر سیرت و تربیتِ ذہن و فکر کے سر و سامان سے یہ خزانہ خالی ہے؟ ان خطوط کے مطالب کی جامعیت، ان کی علمی قدر و قیمت

اور افراد و قوم و ملک کی تعمیر اور تربیت میں ان کی اہمیت کا جائزہ ابھی نہیں لیا گیا ہے۔ اس لیے ان کے علمی و ادبی مقام کے تعین اور اس کے واقعی اعتراف میں کسی کا رہوارِ شوق رہنما نہیں۔ اس باب میں ہم ابھی تک حیرت و استعجاب کے مقام پر ہیں۔

الہلال و البلاغ اور دیگر اخبارات و رسائل میں شائع ہونے والے سیکڑوں مقالات بے شمار موضوعات پر اور مختلف علوم و فنون میں یادگار اور ان کے ذوق و نظر کی بلندیوں، علم کی بے پناہیوں اور ان کے کمالات ذہن و دماغ کی پہنائیوں کے ترجمان ہیں۔

مولانا آزاد کے یہ تمام خصائص ذہن و فکر، محاسنِ علم و نظر اور تصنیف و تالیف اور تحقیق کے بے پناہ کمالات جوان کی تحریرات و نگارشات میں نمایاں ہوئے ہیں، کیا ایسے نہیں کہ ہم ان کا اعتراف کسی ذہنی تحفظ کے بغیر اور برملا کریں؟ اگر ہم ایسا نہ کر سکیں تو یہ ہماری علم دوستی، انصاف پسندی اور حق پروری سے بعید ہے۔ پھر کیا ہم یہ پسند کریں گے کہ ہمارے اخلاق و سیرت کے بارے میں کوئی ایسی رائے قائم کر لی جائے جو واقعی نہیں ہونی چاہیے۔

مولانا ابوالکلام آزاد ایک سیاست داں بھی تھے۔ ان کا شمار اس عہد کے نامور مدبروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے برصغیر کی سیاست میں اپنے فکر و تدبر کے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ یہ نقوش ملک کی سیاسی زندگی کے ہر دائرے میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے اپنے فہم اور بصیرت کے مطابق ایک خاص جماعت کو اپنی سیاسی تگ و تاز کا میدان بنایا لیکن ان کی بصیرت و رہنمائی کی کارفرمائیاں نہ صرف کانگریس کی قرار دادوں کی اصلاح و تزئین اور متحدہ قومی مقاصد کے مطابق اس کے فیصلوں میں دیکھی جا سکتی ہیں بلکہ مجلس خلافت اور جمعیت علمائے ہند کی سیاست اور تعمیر و خدمت قوم و ملت کے کاموں میں، مجلس احرار اسلام کے قیام میں، مومن کانفرنس، جمعیت القریش، شیعہ پولیٹیکل کانفرنس، مسلم مجلس کے پیشِ نظر مقاصد اور ان کی قومی و ملی خدمات میں حتیٰ کہ مسلم لیگ کے نصب العین کی تبدیلی میں اور جماعتِ اسلامی کی تشکیل و مقاصد میں رنگ لائی ہیں۔ حتیٰ کہ تبلیغی جماعت کا انداز و طریق مولانا کی حزب اللہ کی ایک ذیلی جماعت "السائحون" کا ٹھیک ٹھیک عکس ہے۔

یہ مولانا کے سیاسی تدبر کا کرشمہ اور ان کی سیاسی عظمت کا ایک پہلو ہے، اس سے کیوں کر انکار کیا جا سکتا ہے۔ اس حقیقت سے بھی کون انکار کر سکتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند، مدرستہ العلوم علی گڑھ، ندوۃ العلماء لکھنؤ، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی اور بنگال سے لے کر پنجاب و سرحد تک اور شمال سے لے کر جنوب تک سیکڑوں تعلیمی اداروں اور خانقاہوں کو ان کے پیش نظر تعلیم و اصلاح کے مقاصد کے ساتھ قومی کاموں میں بھی حصہ لینے اور دینی خدمات کے ساتھ ملک و قوم کے فرائض کی ادائیگی کی طرف توجہ دلانے میں اور ان کاموں کے لیے اپنے اوقات کا ایک حصہ وقف کر دینے کی سب سے قوی تحریک مولانا کی زبان اور قلم نے پیدا کی۔

مولانا نے سیاسی زندگی کا آغاز کیا تھا تو مسلمانوں کے لیے ایک ذہنی رکاوٹ اور دلوں میں خوف موجود تھا۔ مولانا کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اس رکاوٹ کو دور کر کے ان کے لیے سیاسی زندگی کے گناہ کے تصور کو بدل دیا، دلوں سے خوف نکال کر انھیں سیاسی اشغال میں مصروف کر دیا، سیاسی جدوجہد کو ان کے لیے بازیچۂ اطفال بنا دیا، اور جمود و سکون کی جگہ انقلاب و تغیر سے ان کے ذہنوں کو آشنا کر دیا۔

مسلمانوں نے ایک زمانے تک یہ عزم کیے رکھا تھا کہ وہ اپنے ہی دست و بازو سے برصغیر کو آزاد کرا دیں گے لیکن ۱۸۵۷ء اور اس کے بعد کئی انقلابی اقدامات میں ناکامیوں، پھر حضرت شیخ الہند کے سفر حجاز اور اسارت مالٹا کے زمانے میں ترکی، جرمنی وغیرہ کے جنگی اسیروں سے ملاقاتوں، مولانا عبید اللہ سندھی کے سفر افغانستان اور روس و ترکی کے زعماء و مشاہیر سے تحریک آزادی کے مسئلے پر تبادلۂ خیالات اور اس سے بہت پہلے مولانا ابوالکلام کے سفر عراق و مصر میں اربابِ سیاست و تدبر اور اصحابِ علم و نظر سے ملاقاتوں اور ملک و بیرون ملک کے حالات کے مشاہدوں اور تجربوں کے بعد ان پر یہ حقیقت واضح ہو گئی تھی کہ ملک کی آزادی برادرانِ ملک کے تعاون اور مشترکہ جدوجہد ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

دوسری حقیقت جو ان پر منکشف ہوئی تھی، وہ یہ تھی کہ ملک کی آزادی، اقوام ہند کی فلاح و بہبود مسلمانوں کی سماجی، تعلیمی، اقتصادی اصلاح و ترقی اور جماعتی زندگی کے قیام کے

ذریعے نیز اسلام کی دعوت و تبلیغ کے بہترین اور اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے غیر مسلم اقوام سے سماجی، سیاسی، اقتصادی تعاون اور ہم سائیگی اور ہم وطنی کے بہترین تعلقات اور اتحاد کی ضرورت ہے۔ نیز یہ کہ ملک کی آزادی نہ صرف اس ملک کی اقوام کے لیے ضروری ہے۔ بلکہ مشرق وسطیٰ کے تمام مسلم ممالک اور ایشیا کی مظلوم و محکوم قوموں کے لیے بھی ضروری ہے۔

ان حقائق کے انکشاف و اعتراف کے بعد انھوں نے سب کچھ برداشت کر لیا لیکن ملک کی آزادی کے لیے مشترکہ جدوجہد اور اتحاد کے نصب العین سے قدم پیچھے نہ ہٹایا۔ اگر کوئی شخص ان حقائق اور مشترکہ قومی نصب العین کی اہمیت کا اعتراف نہ کرے تب بھی مولانا کی مجرد سیرت کی پختگی، فیصلے کی محکمی، عزم کے رسوخ اور استقامت وعزیمت کے کمال کا اعتراف تو کرنا ہی چاہیے کہ یہ خوبیاں بہر حال خوبیاں ہیں جو ہر کس و ناکس میں نہیں ہوتیں۔ جس وجود و شخصیت میں یہ خوبیاں اپنا آشیانہ بناتی ہیں اس کا شمار نادر روزگار شخصیات میں ہوتا ہے۔

لیکن کیا ملک کی آزادی کے لیے مشترکہ جدوجہد کی ضرورت اور اتحاد کے نصب العین کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا جا سکتا تھا؟ اس خیال کو کوئی سنجیدہ شخصیت اپنے دماغ کے کسی گوشے میں بھی جگہ نہ دے سکتی تھی۔ ملک کی آزادی کی اہمیت تمام اقوام کی فلاح و بہبود اور تعمیر و ترقی کے نقطۂ نظر کے علاوہ، اس لحاظ سے بھی اہمیت رکھتی تھی کہ اس تحریک کے ایک دور میں اور مسائل کے تجزیہ و تصفیہ کے نتیجے میں یہ تصور ابھرا کہ اس مسئلے کو اس طرح کیوں نہ حل کیا جائے کہ ملک کی دو بڑی اور اہم قوموں کو ملک کے الگ الگ خطے دے کر ان کے سیاسی اقتدار اور انتظام و انصرام کے اختیارات دے دیے جائیں۔

جہاں تک برصغیر میں بسنے والی قوموں میں اتحاد کی ضرورت کا تعلق ہے، اس سے کسی کو مجالِ انکار نہ تھی۔ اتحاد کی اہمیت کو ہر روز غروبِ آفتاب نے دن کے تجربات کی رہنمائی میں واضح کیا، اور ہر صبح کو طلوع ہونے والے سورج کی روشنی نے واضح تر کیا ہے۔ پہلے ملک کی آزادی کے لیے مشترکہ جدوجہد اور اقوام کی ترقی کے لیے قومی اتحاد کی ضرورت تھی۔ برصغیر کی آزادی کے بعد پاکستان اور ہندوستان کے الگ الگ دائروں میں قومی

اتحادوں کی ضرورت ہے اور پھر برصغیر کی سطح پر دونوں ملکوں کے قومی اور وسیع تر اتحاد کی ضرورت ہے۔ اب اس میں بنگلہ دیش کو بھی شامل کر لینا چاہیے۔ یہ ضرورت پہلے بھی تھی، آج بھی ہے اور آیندہ بھی رہے گی اور وقت کی کوئی گردش اور حالات کی کوئی کروٹ اس کی اہمیت کے نقش کو نہ مٹا سکتی ہے نہ مدھم کر سکتی ہے۔

جس شخص کو اس حقیقت کا سب سے زیادہ ادراک اور اس کی اہمیت کا سب سے قوی احساس تھا، کیا اس کی نظر و بصیرت اور حقائق شناسی کا اعتراف نہ کرنا چاہیے؟

تحریک پاکستان کے جواز سے کون جرأت انکار کر سکتا تھا۔ اگر ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلے کا ایک حل ایک خاص منصوبے یا تجویز کی شکل میں سامنے آیا تھا تو کیا اس پر غور و فکر سے دماغ کو انکار کر دینا چاہیے تھا؟ ہرگز نہیں۔ کوئی ہوش مند شخص اپنے دل میں یہ خیال بھی نہیں لا سکتا تھا، یہ ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلے کی ایک خالص سیاسی تجویز تھی لیکن اسے جو فرقہ وارانہ رنگ دیا گیا تھا، وہ پورے برصغیر کے مسلمانوں کے مفاد میں ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ پورے برصغیر سے تمام مسلمان ہجرت کر کے پاکستان کے مشرق و مغرب کے حصوں میں نہیں جا سکتے تھے۔ یہ بات پاکستان کے مفاد میں بھی نہ تھی۔ پھر اگر مسلمانوں کے کسی عضو کو غیر پاکستان ہی میں رہ جانا تھا تو مٹا دیے جانے یا بھلا دیے جانے کے بجائے ان کے حفظ و بقا اور اجتماعی تعمیر و ترقی کے سر و سامان کی بھی ضرورت تھی۔

کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اس ضرورت کا شدید احساس مولانا ابوالکلام کو تھا اور قیام پاکستان کے بعد اگر ایک طرف وہ ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کے زخموں کے لیے مرہم فراہم کر رہے تھے تو دوسری طرف پاکستان کے استحکام و ترقی کے وہ شدید آرزو مند تھے۔ ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کو جنھیں بہ ہر صورت ہندوستان ہی میں رہ جانا تھا، اگرچہ مٹا دینے اور بھلا دیے جانے (WRITE OFF) کا ارشاد ہوا تھا لیکن ہندوستان میں ان کی ایک ہزار سال کی عظیم الشان تاریخ و تہذیب اور عجائب روزگار تاریخی آثار، ایشیا میں ان کے نادر الوجود علمی، تعلیمی اداروں اور روایتوں کو مٹا دیا جانا تو کجا بھلا دینے بلکہ نظر انداز کر دیے جانے کا بھی تصور نہیں کیا جا سکتا تھا، ان کے زخموں

کے لیے مرہم مولانا ہی نے مہیا کیا تھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ انھوں نے بہ حیثیت مسلمان آزادی کی تحریک میں بے مثال حصہ لے کر اور آزاد ہندوستان کی تعمیر و ترقی کی جدوجہد میں شریک ہو کر اپنے ذوقِ عمل اور حسنِ سیرت سے مسلمانوں کا سر بلند کر دیا اور آج وہ بھی جنھوں نے ماضی میں خواہ فرقہ وارانہ سیاست کی نقش آرائی میں اپنی فکری و عملی صلاحیتیں صرف کی ہوں، سربلند کر کے کہہ سکتے ہیں کہ وہ آزاد ملک کے آزاد، ذمہ دار اور قابلِ فخر شہری ہیں۔

برصغیر میں نصف ملتِ اسلامیہ کی خدمت کے لیے اگر ایک قیادت تحسین و آفرین کی سزاوار ہو سکتی ہے تو کیا ملتِ اسلامیہ کے نصف ثانی کی خدمت اور ان کے مفادات کی نگہبانی، ان کے زخموں کے لیے مرہم کی فراہمی اور ان کے لیے ایک آبرومندانہ زندگی کے حصول کی جدوجہد کے لیے دوسری رہنمائی کے اعترافِ عظمت میں ایک مومن قلب اور مسلم زبان قاصر رہ جا سکتی ہے؟

اگر ایسا نہیں تو آئیے ہم مولانا آزاد کی ملّی خدمت گزاریوں اور صداقت شعاریوں کا اعتراف کریں، ان کے شکر گزار ہوں اور اس طرح اپنی حق پسندی اور صداقت شعاری کا ثبوت دیں۔

ان کے ذہن و فکر کی آرائش میں قدیم و جدید علوم و فنون نے حصہ لیا تھا۔ جو کچھ قدیم تھا وہ انھیں ان کے بزرگوں سے ورثے میں ملا تھا جو کچھ جدید تھا اس کے لیے انھوں نے خود اپنی راہ بنائی تھی۔ علوم و فنون کے بہترین ذوق اور سیرت کے محاسن نے ان کی شخصیت کو ظاہر و باطن سے آراستہ و پیراستہ کیا تھا۔ یہ ہمارے ذوق و توفیق کا امتحان ہے کہ آیا ہم ان کی شخصیت کے ان محاسن کا اعتراف کرتے ہیں یا نہیں!

ایک خوبی ان کی شرافت نفسی تھی۔ ان کی شرافت کا اظہار ان کی سیرت کی ایک ایک ادا سے زندگی کے ایک ایک رویے سے، خوردوں سے ان کے برتاؤ سے، دوستوں کے ساتھ ان کے معاملات سے اور معاصرین کے بارے میں ان کے طرزِ عمل سے ہوتا ہے۔ وہ اپنے خوردوں کے لیے سراپا شفقت تھے، اور دوستوں سے ان کا معاملہ لطف و محبت کا تھا۔ معاندین کے رویوں پر وہ ہمیشہ خاموش رہے، اور مخالفین کے سب و شتم کے جواب میں ان کی زبان سے فہم و بصیرت اور نیک عمل کی توفیق کے لیے دعا ہی نکلی۔

مولانا کی شخصیت کی اس خوبی کا انکار کیوں کر ممکن ہے کہ وہ اسلامی تہذیب کا نمونہ تھے۔
یہ تہذیب ان کی نشست و برخاست سے، بات چیت سے، گفتگو کے انداز سے، کھانے
پینے سے، ذوق و شوق سے، عادات و خصائل سے، ان کے وضع و لباس سے، شکل و
شمائل سے ظاہر ہوتی تھی۔ ان کا وجود ہندوستان میں اسلامی تہذیب کے لٹے ہوئے
قافلے کی آخری یادگار تھا۔

اپنے ظاہر کے حسن، باطن کے کمال، علم و فضل کی نہایت، فکر و نظر کی بلندی، سیرت
کی پاکیزگی اور ان تمام محاسن کی جامعیت کے لحاظ سے اگر کوئی وقت کا "امام الہند" بننے
کا اہل تھا تو برصغیر کی وہی ایک شخصیت تھی جسے دنیا ابوالکلام آزاد کے نام سے جانتی ہے۔
کیا وجہ ہم ان کے اس مقام اور ان کی عظمت کا اعتراف نہ کریں۔

ابوسلمان شاہجہان پوری
۳۰ / جولائی ۱۹۸۶ء

خطاب

مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم)

سیرت و شخصیت اور علمی و عملی کارنامے

مولانا سعید احمد اکبر آبادی

معزز حضرات! محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب! علمائے کرام! بزرگو اور دوستو! مولانا ابوالکلام آزاد ہماری ملّت کے کاروانِ رفتہ کے ان پاسبانوں اور نگہبانوں میں سے تھے۔ جن کا جب ذکر آتا ہے اور جب ان پر تقریر کرنے کے لیے کوئی مرحلہ سامنے آتا ہے تو عزیز لکھنوی کا وہ شعر بے ساختہ یاد آجاتا ہے ؎

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

اس لیے کہ ان کے ساتھ جو پرانی یادیں وابستہ ہیں اور جو پرانے واقعات ان سے متعلق ہیں، ان کا نام زبان پر آتے ہی وہ سب دل و دماغ میں اجاگر ہو جاتے ہیں اور ایک حسرت پیدا کرتے ساتھ ہی عہدِ گذشتہ میں لے جاتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد ان لوگوں میں سے تھے جن کو ہم عبقری "Genius" کہتے ہیں۔ اعلیٰ درجہ کی ذہانت و فطانت اور بلند درجہ کی قوتِ فہم و ادراک کے حامل تھے۔ میرا بچپن تھا۔ جب مولانا کی شخصیت اور شہرت کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ میں دیوبند میں پڑھتا تھا اور مولانا کے تذکرے

اور چرچے سنتا تھا۔ گو مجھے دیوبند کے قیام کے عرصے میں ان جلسوں میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ جن میں مولانا کی بڑی شاندار تقریریں ہوتی تھیں۔ اس لیے کہ میں طالب علمی کے زمانے میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتا تھا اور باہر کی دلچسپیوں سے زیادہ واسطہ نہیں رکھتا تھا۔ میرا سب سے پہلا اتفاق مولانا سے ملاقات کا ۱۹۳۶ء میں ہوا۔ اس کے بعد سے آخر وقت تک جب کہ مولانا اس دنیا سے رخصت ہوئے، مجھے ان کی خدمت میں بیٹھنے، ان کو قریب سے دیکھنے اور ان کی شخصیت کے مطالعے کا بھی موقع ملا۔ اس بنا پر میں اس وقت آپ کے سامنے جو کچھ بھی عرض کروں گا، اس کے دو حصے ہوں گے۔ پہلا وہ جس کو میں نے اپنے بزرگوں، دوستوں اور ساتھیوں سے سنا ہے اور دوسرا حصہ ان واقعات پر مشتمل ہوگا، جن کا میں نے خود ذاتی طور پر مشاہدہ کیا ہے۔

مولانا آزاد کا خاندان اور تعلیم:

مولانا ابوالکلام آزاد ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے جو پیری مریدی کا گھرانا کہلاتا ہے جہاں بیعت کا رواج اور تصوف کا بڑا چرچا تھا، اور مولانا آزاد کے والد بزرگوار کے عقیدت مندوں اور مریدوں کا ایک بڑا وسیع حلقہ تھا۔ لیکن مولانا آزاد کی طبیعت میں ان طور طریقوں سے بغاوت کے رجحانات شروع ہی سے تھے۔ انھوں نے اس طریقے کو پسند نہیں کیا۔ ان کی تعلیم کہاں پر ہوئی اور کس طرح انھوں نے مختلف علوم پڑھے اس کی بھی کچھ زیادہ تفصیل نہیں ملتی ہے۔ لیکن مولانا نے اس کے متعلق خود جو آخری بات اپنی کتاب 'India wins freedom' میں اپنے ذاتی حالات کے سلسلے میں لکھی ہے۔ وہی میرے خیال میں زیادہ مستند سمجھی جانی چاہیے۔ مولانا کی تعلیم کسی مستند اور باقاعدہ مدرسہ میں نہیں ہوئی۔ لیکن ان کے والد ماجد بہت بڑے بزرگ تھے اور ان کے حلقۂ ارادت میں بڑے بڑے علماء داخل تھے جو صاحبانِ فن تھے اور خاص خاص فنون میں بڑی دستگاہ رکھتے تھے۔ ان کے والد ماجد نے مولانا کو بچپن ہی میں بغرضِ تعلیم مختلف علوم و فنون کے ماہر علماء کے سپرد کر دیا۔

مولانا کا ذوق علمی:

مولانا نے علوم دینیہ و اسلامیہ اور فنون عربیہ کی تحصیل تو کی ہی تھی، لیکن دوسرے علوم و فنون میں ان کی وسعتِ نظر کا کیا حال تھا! اس کا اندازہ آپ کو اس سے ہو سکتا ہے کہ ہمارے اربابِ علم اس بات کو جانتے ہیں کہ ابو ریحان البیرونی کی ایک مشہور کتاب "قانون مسعودی" کے نام سے ہے یہ کتاب دقیق ریاضی یعنی Higher Mathamatics کی کتاب ہے، جو لوگ ریاضیات میں بہت اونچا مقام رکھتے ہیں۔ وہی اس کتاب کو پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں۔ عام تعلیم یافتہ حضرات کی سمجھ میں اس کی بات آتی ہی نہیں ــــ میں نے متعدد لوگوں سے سنا تھا کہ مدرسۂ عالیہ، کلکتہ کے کتاب خانے میں جس زمانے میں مدرسہ کے پرنسپل سر ڈینی سن راس تھے۔ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۰ء تک ایک نادر نسخہ 'قانون مسعودی' کا موجود تھا۔ نادر اس لیے کہ اس وقت تک اور شاید تا حال اس کے سوا کسی اور نسخے کا پتا نہیں چلا۔ مدرسہ عالیہ کی لائبریری اپنے بعض نوادر کے اعتبار سے خاص خصوصیت رکھتی تھی۔ بتایا جاتا ہے، کہ ایک روز سر ڈینی سن راس جو لائبریری کے انچارج بھی تھے، اور جنھوں نے یہ قانون بنا رکھا تھا کہ کوئی شخص بھی جو سولہ سال سے کم عمر کا ہو اس لائبریری سے استفادہ نہیں کر سکتا۔ ایک روز چپڑاسی نے آکر اطلاع دی کہ ایک تیرہ چودہ سال کا خوبصورت سا لڑکا کہتا ہے کہ میں لائبریری میں قانون مسعودی کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں۔ سر راس کو بڑا تعجب ہوا، اس نے اس لڑکے کو اپنے پاس بلایا۔ وہ تھے مولانا ابو الکلام آزاد۔ ان سے سر راس نے کہا، میاں صاحبزادے! آپ کیا دیکھنا چاہتے ہیں! انھوں نے جواب دیا قانون مسعودی، سر راس نے پوچھا کیا آپ اسے پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں! مولانا نے کہا کہ جناب والا آپ کتاب منگا لیجیے اور کوئی صفحہ مجھے بتائیے اگر میں اس کو پڑھ کر آپ سنا دوں اور اس کا مطلب بیان کر دوں، تو مجھے اس کے مطالعے کی اجازت ملنی چاہیے۔ چنانچہ سر راس نے یہی کیا، انھوں نے اپنی کوٹھی میں جہاں مولانا سے یہ گفتگو ہوئی اور جس میں، میں اپنی

پرنسپلی کے زمانہ میں خود بھی رہا ہوں، کتاب کا نسخہ منگایا اور ایک مقام کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا کہ صاحبزادے یہاں سے اسے پڑھو، مولانا نے تھوڑی دیر اس کا مطالعہ کیا اس کے بعد اسے سنایا اور اس کا مطلب بیان کر دیا۔ سر ڈینی سن کو بڑا تعجب ہوا، اور انھوں نے اس لڑکے کو مستقل طور پر لائبریری کی کتب سے استفادہ کی اجازت دے دی۔

یہ واقعہ میں نے سن رکھا تھا لیکن مجھے اس کی صحت پر یقین نہیں آتا تھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ مگر اس کے بعد جب میں مدرسۂ عالیہ میں پرنسپل تھا تو میرے زمانہ میں نیشنل پبلک لائبریری کی جو کلکتہ کی بڑی مشہور لائبریری ہے، اس کی ایک نئی بلڈنگ بنی۔ جس کے افتتاح کے لیے مولانا آزاد وزیر تعلیم حکومت بھارت کی حیثیت سے تشریف لائے تھے۔ مولانا نے تقریر تو اردو میں کی لیکن ان کا خطبہ انگریزی میں چھپا ہوا تھا۔ مولانا نے اس میں اس واقعہ کا مفصل ذکر کیا تھا[1] جس کے بعد اس نسخہ کی تلاش شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ لندن کی لائبریری کو منتقل ہو گیا۔ جب مولانا کے علم میں یہ بات آئی تو ان کی کوشش سے وہ نسخہ وہاں سے حاصل کیا گیا۔ پھر دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن کے زیر اہتمام اس کی اشاعت ہوئی اور مولانا ابوالکلام آزاد کا اس پر مقدمہ موجود ہے۔

یہی ایک واقعہ بتاتا ہے کہ مولانا کے اندر عبقریت کتنی اعلیٰ معیار کی تھی۔ وہ اپنی ذہانت و فطانت کے اعتبار سے اپنے ہم عصروں کے اندر بہت ہی ممتاز تھے۔

مولانا آزاد کا علمی مقام:

مولانا آزاد کا اپنے علم و فضل کے لحاظ سے کیا مقام تھا! اس سلسلے میں دو واقعات آپ کو سناتا ہوں۔

ایک واقعہ تو یہ ہے جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ جس زمانہ میں میں مدرسۂ عالیہ کا پرنسپل تھا، اس زمانے میں مولانا عبدالحلیم صدیقی جو ایک مشہور عالم از جمعیت العلماء ہند کے ایک مشہور ورکر تھے وہ مدرسۂ عالیہ میں محدث تھے۔ جب ان کا تین سال کا کنٹریکٹ ختم ہو گیا تو میں نے ویسٹ بنگال گورنمنٹ کے متعلقہ محکمہ کو لکھا کہ ان کے

کنٹریکٹ کی تجدید نہ کی جائے۔ بلکہ ان کو سبکدوش کر دیا جائے تاکہ ان کی جگہ کسی دوسرے توانا اور جوان عالم کا تقرر کیا جا سکے، میرا ارادہ تھا کہ میں ان کی جگہ کسی اونچے درجہ کے محدث کو لاؤں گا۔ میری نظر میں اس وقت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی تھے۔ ان ہی دنوں میں مجھے دہلی آنے کا اتفاق ہوا، مولانا کو علم ہوا تو انھوں نے مجھے بلا بھیجا۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ پارلیمنٹ کے اجلاس ہو رہے تھے، وہیں آنے کے لیے مجھے کہا گیا۔ میں پارلیمنٹ میں ان کے کمرے میں پہنچ گیا۔ مولانا نے مجھے نو بجے صبح کا وقت دیا تھا۔ اور ٹھیک نو بجے مولانا اپنے کمرے میں تشریف لے آئے۔ مولانا نے پہلے تو میری مزاج پرسی کی۔ مولانا روزے سے تھے۔ موسم ابھی گرم تھا۔

ہندوستان میں تدریس حدیث اور آخری اسناد:۔ تھوڑی دیر بعد مولانا نے کہا "میرے بھائی" مولانا کے خطاب کا عموماً انداز یہی ہوتا تھا۔ میں نے آپ کو اس لیے بلایا ہے کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ مولوی عبدالحلیم صدیقی کے کنٹریکٹ کی تجدید کے حق میں نہیں ہیں۔ میں اس کی وجہ آپ سے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ وہ شیخ الحدیث کی جگہ ہے۔ مولانا اب بوڑھے ہو گئے ہیں۔ وہ اس معیار کی اب تعلیم نہیں دے سکتے۔ جس کی ضرورت ہے۔ لہٰذا میں ان کی جگہ ایک دوسرے محدث کو لانا چاہتا ہوں۔ مولانا ادیب ہیں، بہت لائق اور عالم ہیں لیکن فن حدیث میں جس طور پر پڑھانا چاہیے، اس طرح تعلیم اب ان کے بس میں نہیں ہے۔ بس میرا یہ کہنا تھا۔ کہ مولانا آزاد میرے سر ہو گئے اور فرمایا کہ آپ نے یہ کیا کہا کہ فن حدیث جس طرح پڑھایا جانا چاہیے، اس طرح مولانا عبدالحلیم نہیں پڑھا سکتے۔ میں نے اپنی بساط کے مطابق عرض کیا کہ فن حدیث کو پڑھانے کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ پڑھانے والا اسماء رجال سے خوب واقف ہو۔ طرق اور مسانید پر بھی اس کی گہری نظر ہو۔ درایت اور روایت کے جو اصول ہیں، ان پر بھی ان کی نظر ہو۔ جرح و تعدیل سے بھی وہ بخوبی واقف ہو ـــــ آپ یقین کیجیے کہ اس پر مولانا نے ڈیڑھ گھنٹے تک مسلسل تقریر کی اور مجھے بتایا کہ فن حدیث دراصل کیا ہے۔ اس کے کتنے اہم شعبے ہیں۔ کتنی شاخیں ہیں۔ ہر شعبہ

اور شاخ کی کیا خصوصیات ہیں۔ ان پر اب تک کون کون سی معتبر کتابیں لکھی گئی ہیں۔ فنِ حدیث کس دور میں اور کس انداز سے ہندوستان میں آیا اور کہاں کہاں اس کی بڑی بڑی درسگاہیں قائم ہوئیں۔ اور فنِ حدیث کو پڑھانے کی خصوصیات کیا رہیں؟ کون کون سے محدثین اب تک ہندوستان میں ایسے گزرے ہیں جو اس فن میں یکتائے روزگار تھے۔ ہوتے ہوتے وہ اس دور تک آ گئے اور فرمانے لگے کہ آج کل پورے ہندوستان میں فنِ حدیث کی تعلیم و تدریس اس طور پر نہیں ہو رہی جس طور پر فنِ حدیث کو پڑھانا چاہیے۔ اس دور میں مولانا عبدالحلیم صدیقی اور ان جیسے گنتی کے محدث ہوں گے جو کچھ نہ کچھ اس فن سے تعلق رکھتے ہیں۔ آنے والے علماء تو معیار کے لحاظ سے ان سے بھی گئے گزرے ہوں گے۔ آپ تجربہ کرنا چاہیں تو کر لیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ تجربہ صحیح نہیں ہوگا۔ آخر میں فرمایا۔ میرے بھائی! اب انور شاہ تو آپ کو ملیں گے نہیں۔ وہ فنِ حدیث کے اساتذہ میں آخری آدمی تھے۔ جو دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اب تو مولانا عبدالحلیم صدیقی ہی کو غنیمت سمجھیے۔ میں رخصت ہونے لگا تو فرمایا، میرے بھائی! میں نے جو کچھ عرض کیا ہے وہ آپ کو یاد رہے گا۔؟ میں نے ازراہِ شوخی کہا "میں یاد نہ رکھوں گا تو کیا اپنے آپ سے دشمنی کروں گا"۔ میری اس بات کو مولانا نے نظر انداز کرتے ہوئے فرمایا "میرے بھائی! اللہ تعالیٰ آپ کو جزا دے"۔ اس جملہ کو تین مرتبہ دہرایا اور تقریباً گیارہ بجے دروازے تک آ کر مجھے رخصت کیا۔

معمولات کی پابندی:

اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ پارلیمنٹ جاری ہے، اس میں بیٹھے ہیں، وزیرِ تعلیم کی حیثیت سے ان کی مصروفیات بھی بے پناہ ہو گئی تھیں، مجھے ذاتی طور پر علم تھا کہ اس دور میں بھی وہ سختی کے ساتھ اپنے دیرینہ معمولات پر کاربند تھے۔ عموماً وہ رات کو نو بجے سو جاتے تھے، پھر ڈھائی بجے بیدار ہوتے تھے اور اس وقت وہ اپنا لکھنے پڑھنے کا کام کرتے تھے۔ فجر کی نماز پڑھ کر سو جاتے تھے، پھر تقریباً ساڑھے آٹھ بجے اٹھ کر نو

بجے دفتر پہنچ جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ وزیر تعلیم کی حیثیت سے مصروفیات کا دائرہ وسیع ہو گیا تھا، پھر عمر بھی ضعیفی کی طرف مائل تھی لیکن ان سب کے باوجود استحضارِ علم کا یہ عالم اور یہ حال کہ فن حدیث پر تقریباً مسلسل ڈیڑھ گھنٹے تک انتہائی عالمانہ انداز میں تقریر کی، جبکہ سامع صرف اکیلا میں تھا۔

وجودِ باری، مذہب کی ضرورت اور اسلام کی حقّانیت:

دوسرا یہ واقعہ میرے مشاہدے میں آیا کہ جوش ملیح آبادی اور مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی یہ دونوں مولانا ابوالکلام آزاد سے بہت زیادہ قریب تھے۔ مگر دونوں جس عقیدے اور خیال کے تھے، ان میں سے جوؔش کو تو آپ سب ہی اچھی طرح جانتے ہیں اور مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی بھی اُس زمانہ میں جوؔش سے اس معاملے میں کچھ کم نہیں تھے مولانا آزادؒ نے ایک دن ان دونوں سے کہا کہ میرا آپ سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ آپ میرے پاس آتے جاتے ہیں لیکن میں نے اپنا ایک فرض اب تک ادا نہیں کیا جس کا مجھے بہت افسوس ہے اور میں اس کا سچے دل سے اعتراف کرتا ہوں۔ اب میں چاہتا ہوں کہ آپ حضرات کے سامنے اپنا وہ قرض ادا کر دوں۔ دونوں حضرات نے کہا! وہ کیا ہے؟ فرمایا کہ اللہ کے وجود اور مذہب کی ضرورت اور اسلام کی حقّانیت پر آپ دونوں کے سامنے میں ایک تقریر کرنا چاہتا ہوں جو میری طرف سے تبلیغِ حق کی ایک کوشش ہو گی۔ آپ حضرات کو حق ہو گا کہ پوری آزادی کے ساتھ میری باتوں پر تنقید کریں، مجھ سے سوالات کریں، مجھ پر جرح کریں، میں پوری خندہ پیشانی سے انھیں سُنوں گا اور امکان بھر آپ کے اشکالات کو دور کرنے کی کوشش کروں گا۔

دونوں حضرات نے رضامندی کا اظہار کیا اور کسی آنے والے دن میں صبح نو بجے کا وقت طے ہو گیا۔ مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی نے مدرسہ فتح پوری میں آکر اپنے حلقہ احباب میں اس کا ذکر کیا تو مولانا محمد میاں مرحوم (جو مولانا حامد میاں مدظلہ کے والد ماجد ہیں جو آپ کے اسی شہر لاہور میں جامعہ مدنیہ کے مہتمم اور رئیس ہیں) اور مولوی قاضی سجاد حسین

صاحب جو مدرسہ اسلامیہ فتح پوری دہلی میں اس وقت مدرس تھے، اب پرنسپل ہیں۔ ان دونوں کو جب خبر ہوئی تو انھوں نے کہا کہ یہ تو بہت اچھا موقع ہے۔ کیا ہم کو بھی اس مجلس میں شرکت کی اجازت ہوگی! چنانچہ فوراً مولانا آزاد سے ان کے سیکرٹری کے ذریعے رابطہ قائم کیا۔ مولانا نے فرمایا کہ بڑے شوق سے آپ حضرات بھی تشریف لائیے اور کوئی بھی آنا چاہے تو میری طرف سے اجازت ہے —

چنانچہ مولانا محمد میاں مرحوم اور قاضی سجاد حسین صاحب کا یہ بیان ہے کہ ہم بھی پہنچ گئے۔ جوش ملیح آبادی اور مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی بھی وہاں موجود تھے۔ ہم چاروں کے سامنے مولانا آزاد نے تقریر کی۔ مولانا محمد میاں کا یہ بیان ہے کہ مسلسل دو گھنٹے تک انھوں نے تقریر کی۔ اور تقریر کا کمال یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی توحید پر سارے دلائل وہ تھے جو قرآن مجید میں ہیں لیکن کہیں قرآن کا حوالہ نہیں دیا کہیں کوئی آیت نہیں پڑھی۔ ان ہی دلائل کو عقلی طور پر اس طرح بیان کیا گویا ان کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں ہے حالانکہ تمام دلائل قرآنی ہی تھے —— اس طرح پر وجود باری تعالیٰ، اس کی توحید، مذہب کی ضرورت اور مذاہب میں بھی اسلام کی حقانیت پر مسلسل دو گھنٹے تقریر کی۔ اس کے بعد مولوی عبدالرزاق صاحب نے کہا! مولانا! مجھے تو اب اطمینان ہو گیا۔ میں اللہ سے توبہ کرتا ہوں۔

لیکن جوش ملیح آبادی نے کہا۔ مولانا! میں آپ کے دلائل کا جواب تو نہیں دے سکتا۔ لیکن دل میرا نہیں مانتا، تو مولانا نے کہا کہ میرے بھائی! دل پر تو میرا کوئی قابو اور اختیار نہیں ہے۔ جوش نے کہا کہ مولانا! آپ نے Personal God اور Impersonal God کی جو بحث کی ہے تو میں God کو Impersonal تو ماننے کے لیے تیار ہوں Personal نہیں مان سکتا۔ Impersonal کے معنی وہ ہیں، جس کو آج کل Energy کہا جاتا ہے۔ مولانا نے فرمایا نہیں وہ God نہیں ہے۔ جو Impersonal ہے، وہ God ہو ہی نہیں سکتا۔ مولانا نے پھر ثابت کیا کہ God وہی ہے جو Personal ہے۔ اس کی ایک

ذات اور ہستی ہے پھر اس کو مزید قوی دلائل سے ثابت کیا گیا ہے۔ پس یہ دو واقعات ایسے ہیں، جن سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ مولانا کا علم کتنا مستحضر تھا، اور ان کی نگاہ کتنی وسیع تھی۔

مولانا آزاد کی دعوت:

مولانا کی شہرت کا آغاز دو چیزوں سے ہوا۔ سب سے پہلے اور سب سے بڑی شہرت کا ذریعہ تو "الہلال" اور "البلاغ" ہوئے۔ اس کے بعد مولانا کی تقاریر ہوئیں۔ مولانا کو اللہ تعالیٰ نے فنِ خطابت کا وہ کمال عطا فرمایا تھا جو نہایت شاذ و نادر ہی کسی کو عنایت ہوتا ہے۔ تقریر سے زیادہ ان کی تحریر نے مسلمانوں میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ تقریر میں بھی فن اور اندازِ خطابت ایسا رچا بسا ہوا تھا کہ تیر کی طرح دل میں پیوست ہوتا تھا۔ اس کی ایک مؤثر ترین وجہ یہ بھی تھی کہ مولانا نے الہلال اور البلاغ میں اپنی تحریروں کے ذریعے مسلمانانِ ہند کو ایک نئی راہ دکھائی جس نے دلوں میں ایک نیا جوش اور نیا ولولہ پیدا کیا۔ عام تعلیم یافتہ مسلمانوں کا جو حال ہوا سو ہوا، لیکن سب سے اہم بات یہ ہوئی کہ علمائے کرام اور خاص طور پر دار العلوم دیوبند کے علمائے عظام کا طبقہ اس سے بہت زیادہ متاثر ہوا، اور دیوبند کے حلقے میں سے بھی بالخصوص شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ۔ وہ اس لیے کہ مولانا ابوالکلام آزاد جس چیز کا پیام دیتے تھے اور جو درحقیقت ان کی دعوت کا اصل محور و مرکز تھا وہ سب کچھ وہ تھا جو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے دل کی آواز تھی، اور ان کے اپنے دل کی لگن اور تڑپ تھی۔ چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ مولانا آزاد کی دعوت میں اپنے دل کی تمنا، آرزو، خواہش اور امنگ کا عکس دیکھتے تھے۔ اس لیے مولانا آزاد کے سب سے زیادہ قدردان علمائے کرام کے حلقے میں حضرت شیخ الہند تھے۔ حضرت بڑی پابندی سے الہلال منگایا کرتے، اور بڑے ذوق و شوق سے ان کا مطالعہ کرتے تھے۔

مسجدِ کان پور کا حادثہ:

جب کانپور کے مچھلی بازار کی مسجد حکومت انگلشیہ کے ہاتھوں شہید کی گئی، جس کے

ردِ عمل میں حکومت کے خلاف ہندوستان کے طول و عرض میں مسلمانوں میں غم و غصہ کا ایک طوفان اٹھا تو حکومت نے آنسو پونچھنے اور اس ہیجان کی شدت کم کرنے کے لیے اس وقت جو یوپی کا گورنر (مسٹر جیمس مسٹن) تھا، اسے دارالعلوم دیوبند بھیجا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اس حادثے پر نہایت سخت مضامین لکھ چکے تھے۔ جن کو اس جوش و خروش میں بڑا دخل تھا جو مسجدِ کانپور کو شہید کرنے کے باعث مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف پیدا ہو گیا تھا۔ تو وہ بھی دیوبند پہنچ گئے۔ جب مولانا آزاد اس موقع پر دارالعلوم دیوبند کے دروازے پر پہنچے تو انھوں نے دیکھا گورنر یوپی اندر پہنچ چکے ہیں، وہاں باقاعدہ جلسہ ہو رہا ہے، جس میں دیوبند کے تقریباً تمام ہی علمائے کرام موجود ہیں، مولانا آزاد نے چاہا کہ وہ اندر جائیں اور جلسہ میں پہنچ کر گورنمنٹ کے اس اقدام پر اپنا احتجاج پیش کریں۔ لیکن وہاں ان کو دروازے پر ہی منتظمین کی ہدایت پر روک دیا گیا اور ان کو بتایا کہ لارڈ صاحب کا حکم ہے کہ آپ کو اندر نہیں آنے دیا جائے، لہٰذا آپ اندر نہیں جا سکتے۔ مولانا آزاد کیا کرتے، دنگا فساد تو ان کے پیشِ نظر تھا نہیں، مجبور ہو گئے۔ اس وقت مولانا کو معلوم ہوا کہ دیوبند کے سارے اساتذہ تو اندر جلسہ گاہ میں موجود ہیں۔ لیکن صرف شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو منتظمین کے اس عمل سے سخت ناراض ہیں اور اپنے گھر پر ہی مقیم ہیں۔ ادھر حضرت شیخ الہند کو جب معلوم ہوا کہ مولانا آزاد آئے ہیں اور ان کو دارالعلوم کے دروازے پر روک دیا گیا ہے تو حضرت نے فوراً مولانا آزاد کو اپنے پاس بلوالیا۔ دو تین دن مولانا دیوبند میں حضرت شیخ الہند ہی کے ہاں مقیم رہے۔ حضرت شیخ الہند کا مولانا آزاد سے تعلق خاطر کا یہ واقعہ بھی شاہد ہے۔

حضرت شیخ الہند کی تحریک اور مولانا آزاد کا اس سے تعلق:

حضرت شیخ الہند سے بعض ساتھی علماء نے پوچھا "حضرت آپ الہلال کا اتنا گہرا مطالعہ کرتے ہیں حالانکہ اس میں تصویریں ہوتی ہیں" حضرت شیخ الہند نے جو جواب دیا وہ اس بات کا آئینہ دار ہے کہ حضرت شیخ الہند کس نظر سے مولانا آزاد کو دیکھتے تھے۔ حضرت

شیخ الہندؒ نے پہلے تو یہ شعر پڑھا ؎

کامل اس طبقۂ زہّاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

پھر فرمایا کہ میاں تم اس بات کو دیکھتے ہو کہ اس میں تصویریں ہوتی ہیں تم یہ بات نہیں دیکھتے کہ وہ فریضۂ جہاد جس سے ہم سب لوگ غافل تھے اس کو سب سے پہلے جس شخص نے یاد دلایا ہے وہ یہی ابوالکلام آزاد ہیں، لہٰذا ہم ان کے نہایت شکر گزار ہیں، اس لیے میں ان کے پرچوں کو بڑے اشتیاق سے پڑھتا ہوں۔ پھر یہ کہ اس کے بعد میں حضرت شیخ الہند نے جو تحریک شروع کی تھی، تحریکِ آزادی، (تحریکِ ریشمی رومال) اس کا حال آپ حضرات کو معلوم ہوگا تو وہ تحریک ایسی تھی کہ اس میں زیر بزمین یعنی Under ground کام ہوتا تھا۔ انگریزی حکومت کے دور میں تو یہ باتیں منظرِ عام پر آ نہیں سکتی تھیں، لیکن اب اس تحریک کے متعلق تمام حالات شائع ہوگئے ہیں جن سے یہ بات صاف معلوم ہوگئی، کہ حضرت شیخ الہند نے انڈر گراؤنڈ کام شروع کر دیا تھا جہاں باقاعدہ اسلحہ سازی بھی ہوتی تھی، اور باقاعدہ ہتھیار چلانے کی ٹریننگ بھی ہوتی تھی۔ چنانچہ جو لوگ حضرت کے ہم خیال تھے، اور ان کے مشن سے تعاون کرتے تھے۔ حضرت نے ان سب سے عہد و پیمان لیا اور وہ سب شیخ الہندؒ کی ہدایت پر خفیہ طور پر اس دعوت اور مشن کے لیے کام کرتے تھے۔ مولانا عبیداللہ سندھی، حضرت شیخ الہندؒ کے سب سے بڑے معاون تھے۔ دوسرے مولانا محمد میاں جو حضرت شیخ الہند کی ہدایت پر کابل چلے گئے وہیں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے صاحبزادے حامدالانصاری غازی ہیں۔ تیسرے مولانا سیف الرحمٰن مرحوم تھے، وہ بھی کابل ہجرت کر گئے تھے۔ پروگرام یہ تھا کہ افغانستان کی حکومت کے تعاون سے اُدھر سے انگریز کے خلاف مسلح اقدام کیا جائے۔ یہ تین بزرگ وہ تھے جو حضرت شیخ الہند کے خاص الخاص اور معتمد علیہ لوگ تھے۔ ان ہی قریب ترین حضرات میں چوتھے نمبر پر مولانا ابوالکلام آزاد کا نام شامل تھا۔ مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ اس واقعے کے بعد جس کانپور کی مسجد شہید کرنے کے سلسلہ

میں ذکر کر چکا ہوں، مولانا دوبارہ بھی کبھی دیوبند تشریف لائے یا نہیں، لیکن اتنا یقین کے ساتھ جانتا ہوں کہ مولانا آزاد سے حضرت شیخ الہند کا رابطہ مسلسل قائم رہا، خط و کتابت کے ذریعہ سے یا زبانی لوگوں کی وساطت سے۔ حضرت کی اس تحریک کے ایک اہم رکن مولانا آزاد بھی تھے، ان تمام شواہد سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کا شیخ الہندؒ سے بڑا قریبی رابطہ و تعلق قائم تھا۔

الہلال کی دعوتِ جہاد و رجوع الی القرآن:

مولانا آزاد نے جیسا کہ آپ نے سنا الہلال اور البلاغ کے ذریعہ ایک دعوت دی اس دعوت کو حضرت شیخ الہند دعوتِ جہاد فرمایا کرتے تھے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ صرف دعوتِ جہاد ہی نہیں تھی بلکہ دعوتِ انقلاب تھی۔ مسلمان اپنے جس فرض کو بھول گئے تھے۔ اس فرض کو مولانا نے یاد دلایا اور اس کے لیے قرآن مجید کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت پر نہایت زور دیا، چونکہ مسلمانوں کے پاس اصل قوتِ تسخیر قرآن ہی ہے۔ مولانا نے اس کام کو منظم طور پر کرنے کے لیے ایک جماعت بنائی۔ مولانا نے جو تنظیم بنائی اس کا نام حزب اللہ تھا۔ اس حزب اللہ کے لیے مولانا نے بیعت لی یا نہیں لی، اس کے متعلق میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ البتہ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ مولانا نے جو حزب اللہ بنائی تھی، اس کے لیے مولانا کے پیش نظر یہ ضرور ہوگا کہ وہ اس میں شمولیت کے لیے بیعت لیں[۲۳]۔ بہر حال یہ مولانا کا مشن تھا اس کے لیے انھوں نے کام شروع کیا تھا اور اس راہ میں پیش رفت بھی کی تھی۔ اتنا مجھے معلوم ہے۔

عوام الناس میں ان کی شہرت کی بنیاد اور اساس ان کی قرآن اور جہاد کی دعوت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہر جگہ انتہائی مقبول ہوئے۔ آپ کے پنجاب میں مولانا بے حد مقبول تھے۔ اس دور کے بڑے بڑے علماء اور دانشور مولانا آزاد کی تحریر، ان کی تقریر اور ان کی دعوت سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ ان کے پیغام نے سوئی ہوئی روحوں کو نہ صرف بیدار کیا بلکہ ان کو ایک ولولۂ تازہ سے سرشار کر دیا اور مولانا پورے

برصغیر خاص طور پر پنجاب کے لوگوں کی آنکھوں کا تارا اور ان کے محبوب رہنما بن گئے۔

ایک بے مثال خطبہ:

اس کے بعد جب تحریکِ خلافت شروع ہوئی تو مولانا نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ اس مسئلہ پر مولانا کی ملک کے مشہور شہروں میں سے اکثر میں نہایت زوردار اور ولولہ انگیز تقریریں ہوئیں، جو صرف خطابت ہی کے لحاظ سے نہیں بلکہ علمی اعتبار سے بھی معرکے کی تقاریر تھیں۔ آگرہ یعنی اکبر آباد میں خلافت کمیٹی کے زیرِ اہتمام ایک عظیم جلسۂ عام میں مولانا نے "مسئلہ خلافت" کے موضوع پر نہایت خطیبانہ اور عالمانہ تقریر کی۔ مَیں خود تو اس جلسہ میں نہیں تھا لیکن مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی مرحوم اور مولانا عتیق الرحمٰن صاحب نیز دوسرے لوگوں سے، جو اس جلسہ میں موجود تھے، میں نے سنا کہ "مسئلہ خلافت" جو اب کتابی شکل میں طبع شدہ موجود ہے۔ یہ پورا کا پورا خطبہ مولانا آزاد نے زبانی دیا تھا۔ اس میں بہ کثرت حوالہ جات تھے جو بالکل صحیح تھے۔ جس سے مولانا آزاد کی ذہانت اور ان کے حافظہ کی پختگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ اس کتاب میں بعد میں بھی مولانا نے کوئی اضافہ اور ترمیم نہیں کی۔ بلکہ یہ کتاب جوں کی توں مولانا کی زبانی تقریر پر مشتمل ہے۔ مولانا آزاد نے اس نوع کی جگہ جگہ تقریریں کیں۔ اور لوگوں کو تعجب ہوتا تھا کہ مولانا کا دماغ تو پورا ایک کتب خانہ معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ شاید ہی مولانا کی کوئی تقریر ایسی ہوتی ہو جس میں مولانا سلف کی کسی نہ کسی معروف علمی شخصیت کی تحریروں کا باقاعدہ حوالہ نہ دیتے ہوں۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ مولانا کا حافظہ اور ان کا مطالعہ کس قدر مضبوط اور وسیع تھا۔

مولانا آزاد کا تبحرِ علمی:

مولانا آزاد کی علمیت کا ذکر زبان پر آیا تو مجھے یہ بات یاد آئی کہ کچھ لوگ کہا کرتے تھے۔ اور شاید اب بھی ایسا کہنے اور سمجھنے والے کچھ لوگ موجود ہوں کہ مولانا آزاد ذہین بہت

زیادہ ہیں لیکن ان کا علم بہت کم ہے۔ لیکن میں آپ کو بتاتا ہوں کہ مولانا کے انتقال کے بعد ایسی ٹھوس شہادتیں مل گئی ہیں جن سے لوگوں کا یہ قول غلط ثابت ہو جاتا ہے۔ ہمارے یہاں نئی دہلی میں حکومت کا قائم کردہ ایک محکمہ ہے۔ جس کا نام انڈین کلچر اینڈ سائنس ریسرچ انسٹیٹیوٹ یا اسی سے ملتا جلتا نام ہے، اس کی ایک بہت بڑی لائبریری ہے اس میں مولانا آزاد کا ذاتی کتب خانہ منتقل ہو گیا ہے جو بے شمار قیمتی کتابوں پر مشتمل تھا اور اس میں بعض نادر کتب کے نسخے بھی شامل تھے۔ اس لائبریری میں جب مولانا آزادؒ کی کتابوں کا جائزہ لیا گیا تو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ بہت کم کتابیں مولانا آزاد کے کتب خانہ کی ایسی تھیں جن پر مولانا کے نوٹ اور حواشی نہ ہوں۔ اس کے برعکس ان کتابوں کی تعداد بہت زیادہ تھی جن پر مولانا نے نوٹ اور حواشی تحریر کیے تھے۔ چنانچہ حکومت نے ایک شخص کو اس کام کے لیے مقرر کیا کہ وہ مولانا کے جن کتابوں پر حواشی ہیں ان سب کو مرتب کر کے پیش کرے۔ چنانچہ تمام حواشی مرتب ہوئے۔ اس کے کچھ حصے رسالہ "اسلام اور عصر جدید، دہلی" میں قسط وار چھپ گئے ہیں۔ ان سے مولانا کی دقتِ نظر اور گہرے غور و فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔ الغرض مولانا آزاد کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ان کا حافظہ بھی نہایت قوی تھا۔ ساتھ ہی انتہائی ذہین و فطین تھے۔

آزادی کی مشترکہ جدوجہد اور عالم اسلام:

مولانا آزاد کی سیاسی زندگی میں اغلباً ۲۶ء سے یہ موڑ آیا کہ مولانا نے جمعیت علماء ہند کے کاموں سے وہ عملی دلچسپی لینی چھوڑ دی جو وہ پہلے مسلسل لیتے رہے تھے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس دور سے مولانا کی تقریباً تمام تر عملی سیاسی دلچسپیاں کانگریس کے لیے وقف ہو گئی تھیں۔ جمعیت علماء ہند کے سالانہ جلسوں میں وہ اکثر تشریف لاتے تھے تقریر بھی کرتے تھے۔ یہ ایک الگ بات ہے۔ لیکن یہ میرے ذاتی مشاہدہ کی بات ہے کہ باوجود اس کے کہ وہ جمعیت کی ورکنگ کمیٹی کے تقریباً ہر دور میں ممبر رہے اور وہ اس کے اجلاسوں میں تشریف بھی لاتے تھے۔ لیکن جمعیت

کے ساتھ ان کی پہلے جو عملی وابستگی تھی، اور اس کے کاموں میں جو سرگرمی تھی، وہ تقریباً ختم ہو چکی تھی، اور ان کی عملی سرگرمیوں کا میدان کانگریس تھی[۵]۔ اب ایسا کیوں ہوا؟ مجھے اس کی تحقیق کا موقع نہیں ملا۔ لیکن مَیں اس معاملہ میں بطورِ قیاس یہ سمجھتا ہوں کہ ہو سکتا ہے کہ مولانا آزاد کو یہ محسوس ہوا ہو کہ ہماری رجوع الی القرآن اور جہاد فی سبیل اللہ کی دعوت ناکام ہو گئی ہے یا یہ کہ دعوت نے اتنی تیز رفتاری سے لوگوں کے اذہان و قلوب کو مسخر نہیں کیا کہ وہ اس کے لیے اس ایثار و قربانی کے لیے آگے آسکیں۔ جو اس دعوت کے لیے ضروری ہے۔ پھر ترکی میں خلافت کا ادارہ خود مصطفےٰ کمال نے ختم کر دیا۔ اس طرح مسلمانوں کے جوشِ عمل پر مایوسی اور سرد مہری طاری ہو گئی۔ لہٰذا انھوں نے سوچا کہ اب تحریک کو دوبارہ زندہ اور متحرک و فعال بنانے کا امکان تو نظر آتا نہیں۔ اس لیے اب سب سے پہلے انگریز کی حکومت کے ہندوستان سے خاتمہ کی طرف زیادہ توجہ ہونی چاہیے، چونکہ نہ صرف ہمارے ہی راستہ کی سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے بلکہ پورے عالم اسلام کو اسی انگریزی حکومت کے ہاتھوں سے بالواسطہ اور بلاواسطہ سخت نقصان پہنچ رہا ہے۔ عالم اسلام کی بھلائی کے لیے بھی انگریزی حکومت کا ہندوستان سے خاتمہ نہایت ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ استخلاصِ وطن کے لیے ملک کی عظیم غیر مسلم اکثریت کی حمایت ضروری تھی، اور چونکہ انڈین نیشنل کانگریس ایک غیر فرقہ وارانہ جماعت تھی، لہٰذا انھوں نے سوچا ہو گا کہ پہلے متحدہ قوت سے انگریزی حکومت پر ضرب کاری لگائی جائے۔ میری رائے یہ ہے کہ انھوں نے ان خطوط پر سوچا ہو گا۔ اور برادران و ابنائے وطن کے ساتھ ایک مشترکہ پلیٹ فارم سے اس حکومت کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے لیے اپنی توجہات اور مساعی کو مرتکز کر دیا ہو گا۔

مولانا آزاد کا انقلابی تحریکات سے تعلق:

مولانا ابوالکلام آزاد ایک زمانہ میں بہت بڑے انقلابی تھے، جنھوں نے ان کی زندگی کے حالات پڑھے ہیں ان کو علم ہو گا کہ مولانا نے خود اعتراف کیا ہے کہ ایک زمانے میں

ملک میں جو انقلاب پسند تھے جن کو انتہا پسند (Extremist) یا جن کو دہشت پسند (Terrorist) کہا جاتا ہے۔ مولانا آزاد کا ان سے بھی کچھ عرصہ تعلق رہا ہے۔ مولانا جلد ہی ان سے الگ ہو گئے۔ چونکہ انھوں نے علیٰ وجہ البصیرت اس طریقے کو صحیح نہیں سمجھا اور انھوں نے کانگریس کے ساتھ استخلاصِ وطن کے لیے تعاون کیا۔ لیکن کانگریس میں اعلیٰ مقام پر فائز رہنے کے باوجود تین باتیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں اور یقینی ہیں:

◎ ایک یہ کہ مولانا نے اپنی وضع و قطع کو کبھی نہیں بدلا۔ کانگریس میں ہمیشہ اسی وضع کے ساتھ رہے۔

◎ اور دوسرے یہ کہ مسلمانوں کے حقوق اور اسلام کے مفادات کو انھوں نے قربان کرنا تو درکنار کبھی نظر انداز بھی نہیں کیا۔ ان امور کے لیے وہ برابر مساعی و جدوجہد کرتے رہے۔

◎ تیسرے یہ کہ قرآن مجید کا جو انقلابی فکر ہے اس کو اجاگر اور مہمیز کرنے والا تحقیقی حواشی کے ساتھ اس کا ترجمہ ان کے پیشِ نظر تھا، اس پر بھی وہ برابر کام کرتے رہے۔ اس کا قدرے تفصیلی ذکر میں آگے کروں گا۔

مولانا آزاد اور پاکستان:

یہ بات کون نہیں جانتا کہ مولانا آزاد کو تحریک سے اختلاف تھا۔ لیکن میں اپنی ذاتی اور عینی شہادت کی بنا پر کہتا ہوں کہ ملک کی تقسیم اور آزادی کے بعد اکتوبر ۱۹۴۷ء میں مولانا آزاد نے لنچ کے لیے چند سربرآوردہ مسلمان رہنماؤں کو مدعو کیا۔ میں تو ان سب سے چھوٹا تھا، اور ان حضراتِ کرام کے ساتھ نتھی ہوتا تھا۔ ان حضرات میں قابلِ ذکر حضرات ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی ہیں۔ اور بھی چند اکابر اس لنچ میں شریک ہوئے، جن کے نام اس وقت ذہن میں مستحضر نہیں ہیں، بہرحال میں بھی مدعوین میں شامل تھا۔

لنچ سے فارغ ہونے کے بعد مولانا آزاد نے فرمایا کہ میں نے آپ حضرات کو اس لیے بلایا ہے کہ میں آپ حضرات سے چند خاص باتیں کرنی چاہتا ہوں۔ سب نے کہا ضرور ارشاد فرمایئے۔ مولانا نے فرمایا :

پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمارا نظریہ پاکستان سے اختلاف تھا، وہ اپنی جگہ تھا، اس کے لیے ہمارے پاس ٹھوس وجوہ اور قوی دلائل تھے۔ لیکن اب جب کہ ملک تقسیم ہو گیا ہے اور پاکستان وجود میں آگیا ہے تو ہم کو پاکستان کے کسی لیڈر یا کسی شخص کے متعلق اپنے دل میں کوئی رنجش اور کدورت نہیں رکھنی چاہیے۔ میرے بھائی! وقت کی ایک سیاست تھی۔ جس سیاست کو کامیاب ہونا تھا وہ ہو گئی۔

اس کے بعد پھر فرمایا :

دوسری بات یہ کہ "اب پاکستان کے لیے کسی طرح کی بدخواہی کرنا یا اس کے لیے کسی طرح کی بداندیشی کرنا نہ صرف ہمارے ملک ہندوستان کے لیے مضر ہے بلکہ خاص طور پر ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کے لیے بھی انتہائی مضر، مہلک اور خطرناک ہے اس واسطے کہ اگر پاکستان بھی ختم ہو گیا یا پاکستان پر کوئی زوال آیا تو پھر ہندوستان کے مسلمان منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہیں گے اور پھر اس پر مستزاد یہ کہ برصغیر میں مسلمانوں کا مستقبل انتہائی تاریک ہو جائے گا۔ ان کے لیے یہاں کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ مولانا نے صاف لفظوں میں کہا کہ اب پاکستان کے ساتھ ہمارا بالکل دوسرا رویہ ہونا چاہیے اور ہم سب کو دعا کرنی چاہیے اور تمنا کرنی چاہیے کہ پاکستان پھلے پھولے اور مستحکم ہو۔

سیاسی اعتبار سے ہماری حکومت بھی کہتی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان ایک (Region) ایک ہی خطہ کے دو ملک ہیں اس (Region) کی سلامتی اور خوشحالی اسی پر موقوف ہے کہ دونوں ملک

اچھے پڑوسیوں کی طرح مل جل کر رہیں، اور دونوں ملکوں میں خیر سگالی اور خیر اندیشی کے جذبات پروان چڑھیں۔"

بھارت کی حکومت کی طرف سے تو یہ ایک سیاسی بات بھی ہو سکتی تھی۔ لیکن میں مولانا آزاد کے متعلق آپ کو بتاتا ہوں کہ وہ تنہائیوں میں ہم سے بڑی شدت اور خلوص کے ساتھ یہ کہا کرتے تھے کہ اب پاکستان سے کوئی اختلاف ہمیں نہیں ہونا چاہیے۔

مسلمانوں کے دینی، ثقافتی مسائل اور فرقہ وارانہ سیاست:

جہاں تک ہندوستان کے مسلمانوں کا تعلق ہے، تو ان کے متعلق مولانا برملا کہا کرتے تھے کہ:

ہماری زندگی کے دو حصے ہیں ایک دینی اور ثقافتی زندگی اور ایک ہے، ہماری قومی اور سیاسی زندگی۔ تو جہاں تک ہماری دینی اور ثقافتی زندگی کا تعلق ہے، میں صاف لفظوں میں آپ سے کہتا ہوں کہ اس میں کوئی (Compromise) نہیں ہو سکتا۔ اس موقعے پر مولانا بے ساختہ ہاتھوں کو جھٹک دیا کرتے تھے۔ اور تکرار کے ساتھ کہا کرتے تھے۔ کہ ہم اپنے دین پر قائم رہیں گے۔ اپنی ثقافت پر قائم رہیں گے۔ اس معاملے میں ہم کسی کے ساتھ کسی نوع کا بھی سمجھوتا نہیں کریں گے۔

لیکن جہاں تک سیاست کا تعلق ہے، مولانا نے کہا کہ میں نے پہلے بھی کہا اور اب بھی کہتا ہوں کہ:

جس ملک میں مسلمان اقلیت میں ہوں وہاں الگ سیاست کا میدان بنانا ان کے حق میں مفید نہیں ہوگا۔ لہٰذا فرقہ وارانہ سیاست کو چھوڑ کر آپ لوگ اب ملکی سیاست میں بھرپور حصہ لیں۔

مولانا کو جب بھی موقع ملتا وہ مسلمان لیڈروں کو اسی کی تاکیدی نصیحت کیا کرتے تھے۔

پاکستان بننے کے بعد کبھی بھی مولانا کی زبان سے نہ جلوت میں نہ خلوت میں، کوئی بدخواہی

کی بات نہیں نکلی بلکہ وہ برملا کہا کرتے تھے۔ کہ:

اب پاکستان کو لازمًا باقی رہنا چاہیے۔ اسے مضبوط اور خوشحال ہونا چاہیے، یہی بات اس کے لیے اور ہندوستانی مسلمانوں کے لیے مفید اور بہتر ہے۔

مولانا کے کیریکٹر کی دو خوبیاں:

مولانا آزاد کے متعلق میں عینی شاہد اور ذاتی معلومات کی بنا پر آپ کو بتاتا ہوں کہ دو چیزیں ان کے اندر لاجواب تھیں:

○ پہلی یہ کہ اپنے مخالف کو کبھی برا بھلا کہنا وہ جانتے ہی نہیں تھے۔ مولانا کے متعلق لوگوں نے کیا کچھ نہیں کہا، ان کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا گیا، لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایک مرتبہ بھی کبھی میں نے مولانا کی زبان سے قائد اعظم یا لیاقت علی خاں یا مسلم لیگ کے کسی دوسرے لیڈر یا خود مسلم لیگ کے متعلق بدگوئی سنی ہی نہیں۔ ان میں اس قدر وسعت ظرف تھی کہ کبھی کسی کی برائی نہیں کرتے تھے، کبھی غیبت نہیں کرتے تھے۔

○ دوسری بات یہ کہ ان کے اندر خودداری نہایت اعلیٰ درجے کی تھی۔ اس کا ایک واقعہ میں آپ کو بتلاؤں۔ قرآن مجید کے ترجمہ کی "ترجمان القرآن" کے نام سے جو پہلی جلد شائع ہوئی تھی تو اس کے کاتب تھے مولانا عبدالقیوم۔ بعد میں وہ ہمارے رسالہ برہان سے وابستہ ہو گئے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ مولانا کا بالی گنج میں جو مکان تھا وہیں انھوں نے مولانا عبدالقیوم کو کتابت کے دوران رہنے کے لیے بلالیا تھا۔ جہاں وہ نو دس مہینے مقیم رہے۔ ان نو دس مہینوں کے قیام میں مولانا عبدالقیوم جو مشاہدات بیان کرتے ہیں، وہ بڑے عجیب وغریب ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مولانا کی بالی گنج میں جو دو منزلہ کوٹھی تھی، میں نے بھی اسے دیکھا ہے۔ تو جب مولانا پر افلاس اور فقر وفاقہ کا دور آیا تو مولانا آزاد نے اس کا اوپر کا حصہ کرائے پر دے دیا یا نیچے کا۔ یہ مجھے اس وقت یاد نہیں۔ بہر حال کوٹھی کا ایک حصہ کرائے پر دے دیا، اور ایک حصہ میں خود رہائش کی۔ مولانا عبدالقیوم بتاتے تھے کہ ہم نے کئی بار دیکھا کہ دوپہر کو کھانے کا وقت ہو گیا اور مولانا کے گھر

میں چولھا نہیں جلا۔ معلوم ہوا کہ مولانا کے گھر کھانا نہیں پکا۔ ایسے حالات میں مولانا اپنے ذاتی ملازم کو بلاتے اور خاموشی سے اسے چونّی دیتے، اور اس سے بازار سے سالن روٹی منگاتے اور مولانا اور ان کی اہلیہ اسی میں گزارا کر لیتے۔ یہ وقت بھی مولانا پر گزرا ہے۔

ایک دن پنڈت جواہر لال نہرو اور گاندھی جی مولانا آزاد کی کوٹھی پر ان سے ملنے کے لیے آئے تو مولانا آزاد اس وقت کھدر کا جو کرتہ پہنے ہوئے تھے وہ مونڈھے کے اوپر سے پھٹا ہوا تھا تو اسی کرتے کو پہنے ہوئے مولانا ان حضرات سے ملے۔ مگر انھوں نے مونڈھے پر ایک چادر ڈال لی۔ ان حضرات نے مولانا سے کہا کہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آج کل آپ مالی مشکلات سے دوچار ہیں، اس ضمن میں ہم آپ کے ساتھ تعاون کرنا چاہتے ہیں۔ مولانا نے جواب دیا کہ مجھے کسی تعاون کی ضرورت نہیں ہے اور ان حضرات کے اصرار کے باوجود مولانا نے کوئی امداد قبول نہیں کی ــــــ

مولانا خیر الدین مرحوم، جو مولانا آزاد کے والد ماجد تھے، کلکتہ میں میمن اور دہلی اور یوپی کے تاجر حضرات، جو کلکتہ میں تجارت کرتے تھے، ان کی بہت بڑی تعداد ان کی مرید تھی۔ مولانا آزاد کے والد کے انتقال کے بعد ان کے مختلف وفود نے مولانا آزاد سے اصرار کیا کہ آپ اپنے والد مرحوم کی گدی سنبھالیے ہم آپ کی وہی تعظیم و تکریم اور خدمت کریں گے جو آپ کے والد بزرگوار کی کیا کرتے تھے۔ مولانا آزاد نے صاف کہہ دیا کہ وہ راہ میرے والد کی راہ تھی، مَیں اس راہ کا آدمی نہیں ہوں۔ مَیں اس نوع کا کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتا۔ انھوں نے کہا کہ ہم تو آپ کی خدمت میں وعظ و نصیحت کے کچھ کلمات سننے کے لیے آنا چاہتے ہیں۔ تو مولانا نے کہا کہ اس مقصد کے لیے مَیں ہفتہ میں دو دن پیر اور جمعرات آپ کو دیتا ہوں۔ عصر سے لے کر مغرب تک آپ لوگ تشریف لاسکتے ہیں مگر ساتھ ہی تاکید کی کہ مَیں کسی قسم کا کوئی نذرانہ، کسی قسم کا کوئی عطیہ آپ حضرات سے قبول نہیں کروں گا۔

الغرض ان کی بے نیازی اور ان کی خودداری کا یہ عالم تھا کہ خود تکلیف اٹھاتے تھے لیکن کسی سے نذرانہ یا عطیہ قبول نہیں کرتے تھے، یہ ان کا مستقل مزاج تھا ــــــ

مولانا کا اخلاق :

پھر ان کے اخلاق کا یہ عالم تھا کہ مَیں بارہ چودہ سال تک بارہا ان کی نجی صحبتوں میں شریک رہا ہوں لیکن مَیں نے کبھی کسی کے متعلق ان کی زبان سے کوئی برا کلمہ یا شکوہ وشکایت کا جملہ نہیں سُنا۔ آپ میں سے اکثر حضرات نے وہ واقعہ سنا ہوگا کہ جب تحریکِ پاکستان کا بہت زور تھا اور یہ تحریک اپنے شباب پر تھی تو اس زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد دہلی سے الہ آباد جا رہے تھے، جب ان کی گاڑی علی گڑھ کے اسٹیشن پر پہنچی تو علی گڑھ یونیورسٹی کے چند طلبہ نے مولانا کے ساتھ گستاخی کا معاملہ کیا، اور مولانا کے ساتھ نہایت نازیبا حرکات کیں۔ پنڈت سندر لال کا بیان ہے کہ ہم نے جب دوسرے دن اخبارات میں پڑھا کہ علی گڑھ اسٹیشن پر مولانا آزاد کے اوپر رکیک حملہ ہوا، اور ان کے ساتھ اہانت آمیز حرکات کی گئی ہیں تو مَیں فوراً الہ آباد پہنچا تاکہ مَیں مولانا سے اس واقعے پر اظہارِ افسوس کروں، اور ان کی دلجوئی کروں۔ پنڈت جی کا بیان ہے کہ مَیں نے جاتے ہی کہا مولانا! بڑے افسوس کی بات ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی کے طلبہ نے آپ کے ساتھ یہ حرکت کی۔ مولانا بجائے غصّہ کے کچھ مسکرائے اور اسی حالت میں کہا کہ پنڈت جی کیا کیا جائے۔ اپنی ہی اولاد ہے، اپنے ہی بچے ہیں۔ شرارت بچے کیا ہی کرتے ہیں، ہوگئی شرارت۔ اب اس پر افسوس سے کیا حاصل، ہم کو کام تو ان ہی سے لینا ہے۔ الغرض مولانا نے اس پر اپنے کسی غم وغصہ کا کوئی اظہار نہیں کیا۔ کوئی ناگواری ان کے اوپر طاری نہیں تھی۔ اور وہ اس افسوسناک واقعے کو بھی پی گئے اور ٹال گئے تھے ــــــ

تو یہ تھے مولانا ابوالکلام آزاد اپنے کیریکٹر کے اعتبار سے اور اپنے اخلاق کے اعتبار سے۔

آزادی کے بعد مولانا آزاد کی عظیم الشان خدمات :

اب مجھے مولانا آزاد کے ان اہم کاموں کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے جو آزادی کے بعد مولانا نے ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کے لیے انجام دیے تھے۔ ہندوستان میں مسلمانوں

کے جو ثقافتی مراکز تھے، مولانا نے ان کو محفوظ رکھنے اور ان کو ترقی دینے کی بڑی کوشش کی۔

دائرۃ المعارف:

چنانچہ دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن، جو عربی کے نادر مخطوطات کی اشاعت کا ایک نامور ادارہ ہے، اسے مولانا مرحوم نے قائم رکھا اور نہ صرف اسے قائم رکھا بلکہ اس زمانے میں اس کی ساٹھ ہزار روپے ماہوار گرانٹ مقرر کرا دی۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہ ادارہ تقسیم سے پہلے جس طرح جاری تھا اس سے کہیں ترقی کے ساتھ وہ اب بھی جاری ہے۔

رضا لائبریری:

اسی طرح ریاست رام پور کا شاندار کتب خانہ جس کا نام رضا لائبریری ہے، اس کے متعلق عام خیال یہ تھا کہ تقسیم کے بعد یہ اجڑ جائے گا۔ مولانا آزاد نے اس کو باقاعدہ حکومت کی تحویل میں لے لیا اور اسے یو پی گورنمنٹ کی نگرانی میں دے دیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ یہ لائبریری ترقی کر رہی ہے اور اس کا لاکھوں روپے کا سالانہ بجٹ یو پی کی حکومت پورا کر رہی ہے۔

خدا بخش لائبریری:

اسی طرح پٹنہ کی مشہور عالم خدا بخش لائبریری کو بھی مولانا کی کوششوں سے حکومت کی طرف سے تمام حفاظتی انتظامات مہیا کیے گئے، اور اس کے لیے بھی مولانا نے لاکھوں روپے کے سالانہ بجٹ کی منظوری حاصل کی۔ یہ ادارہ بھی نہ صرف باقی ہے بلکہ ترقی پذیر ہے۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ:

اسی طرح علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا معاملہ ہے، اس کو بچانے میں مولانا آزاد کا بہت بڑا حصہ ہے۔ وہاں مولانا نے آزادی کے بعد اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا۔ عربی کے شعبے کو کافی ترقی دی۔ اسلامیات کے شعبے کو وسیع تر کیا۔ اور آج اگر آپ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو دیکھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ وہ ہندوستان یعنی بھارت ہی کی نہیں بلکہ ایشیا کی ان عظیم الشان یونیورسٹیوں میں سے ہے جن پر مسلمان بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ اس کی ترقی میں بہت بڑا دخل مولانا ابوالکلام آزاد کا ہے۔

جامعہ ملیہ اور دیگر ملی ادارے:

کم و بیش یہی صورتِ حال جامعہ ملیہ دہلی کی ہے، اور بھارت کی ایک مثالی یونیورسٹی

کا مقام حاصل کر چکی ہے۔ مزید براں کئی دینی مدرسے اور ثقافتی مراکز مولانا کی کوششوں سے شرارت پسندوں کی دست برد سے محفوظ رہے ہے۔ الغرض مولانا ابوالکلام آزاد نے آزادی کے بعد نہایت نامساعد حالات میں بھارت میں مسلمانوں اور اسلام کی خدمت بڑی جرأت، دلیری، ہمت اور بہادری کے ساتھ کی ہے۔

عظیم ترین کارنامہ "ترجمان القرآن":

علمی طور پر مولانا کے بہت عظیم الشان کارنامے ہیں، لیکن ان کا سب سے بڑا اور عظیم ترین کارنامہ ہے۔ "ترجمان القرآن" جو مولانا کی تفسیر ہے۔ اس کو تفسیر کے بجائے ترجمہ اور اس پر مفصل حواشی کہنا زیادہ موزوں ہوگا، اس کی سب سے بڑی خصوصیت وہ ہے جس کے متعلق مولانا آزاد نے خود اس کے مقدمے میں لکھا ہے کہ اب تک جتنے بھی تراجم کیے جا چکے اور تفاسیر لکھی جا چکی ہیں، یہ کام اب تک کسی نہ کسی خاص نقطۂ نظر کے تحت کیا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تفسیر کے جتنے بھی ادوار ہیں، اُن میں پہلا دَور ہے تفسیر ماثور کا۔ تفسیر ماثور کے معنی ہیں "تفسیر قرآن احادیث کے ذریعے سے، جیساکہ ابن جریر طبری کی تفسیر ہے۔ یہ ایک اہم چیز ہے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے، لیکن اس میں سب سے بڑا نقص یہ ہے جس کی طرف امام احمد ابنِ حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اشارہ کیا ہے، کہ اس کے اندر درج شدہ روایتوں کی جانچ پرکھ میں وہ احتیاط اور سختی نہیں برتی جو برتنی چاہیے تھی۔ امام احمد ابنِ حنبل نے فرمایا کہ تین چیزیں ایسی ہیں جن کے پیش نظر احادیث کو نہایت احتیاط سے قبول کرنا چاہیے، ایک ملاحم، دوسری مغازی اور تیسری تفسیری روایات۔ امام موصوف نے فرمایا کہ ایسی احادیث جرح و تعدیل اور جانچ پرکھ کے بغیر تفسیر میں داخل کر دی جاتی ہیں جن کی وجہ سے قرآن مجید کے مطالب اور مقصود میں انتشار و اختلال پیدا ہو جاتا ہے، دوسری بات میں عرض کروں، وہ یہ کہ ضعیف روایات کے علاوہ تفسیر ماثور میں اسرائیلیات نے بہت راہ پالی ہے۔

اسرائیلیات وہ روایتیں ہیں جو قدیم محرّف کتبِ سماویہ کے مطابق ایک طبقے نے

عام طور پر مسلمانوں میں پھیلا دی ہیں۔ ان پر ہمارے قدیم و جدید علماء نے بڑی تفصیل سے بحثیں کی ہیں۔ ان اسرائیلیات کا نہایت ہی قلیل حصہ ایسا ہے جس کے متعلق علماء یہ کہتے ہیں کہ ان کو درج کیا جا سکتا ہے چونکہ وہ ہماری کسی منصوص اور صحیح روایت سے معارض نہیں۔ لیکن ان اسرائیلیات کا بہت بڑا حصہ وہ ہے جو قابلِ رد ہے اور جو درحقیقت قرآن مجید کے اوپر ایک نوع کی تعدی اور زیادتی کا حامل ہے۔ مثلاً، ہاروت و ماروت کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ ان کے بارے میں اسرائیلیات کی ایک عام روایت ہے جس کے متعلق نہایت افسوس کے ساتھ عرض کرتا ہوں، کہ ہمارے شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ جو کہ بہت بڑے محدث ہیں، یقیناً ان کا مقام بہت بلند ہے، ان کی جو تفسیر عزیزی ہے اس میں انھوں نے اس کو نقل کر دیا ہے۔

وہ روایت یہ ہے کہ ہاروت و ماروت دو فرشتے تھے جو زمین پر دو عورتوں پر عاشق ہو گئے جن کا نام تھا زہرہ اور مشتری۔ وہ جانتی تھیں کہ ان دونوں فرشتوں کے پاس اسمِ اعظم ہے۔ تو انھوں نے ان سے کہا کہ ہم تم کو اس وقت اپنے قرب اور وصل سے شاد کام کریں گی جب تم اسمِ اعظم ہمیں سکھلا دو۔ پس انھوں نے اسمِ اعظم ان کو سکھلا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ عورتیں آسمان پر چلی گئیں، ایک زہرہ ستارہ اور دوسری مشتری ستارہ بن گئی۔ اور رہے ہاروت و ماروت تو ان کو ایک اندھیرے کوئیں میں الٹا لٹکا دیا گیا۔ حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح کوئی شخص ان کو سن سکتا اور برداشت کر سکتا ہے۔ ایک نہیں بے شمار اسرائیلیات ہیں جن کو عقلِ عام بھی سننا گوارا نہیں کرتی چہ جائیکہ ان کو تفسیری روایات کے طور پر جگہ دی جائے۔ حضرت داؤدؑ کے متعلق حضرت سلیمانؑ کے متعلق، جنت و دوزخ سے متعلق، حضرتِ آدم کے جنت سے نکلنے کے متعلق وغیرہ وغیرہ۔

اس قسم کی روایتیں ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی سمجھ دار آدمی کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ اس قسم کی روایات تفسیر میں لائے مگر یہ ہوا۔ اور اکثر تفسیر ماثور کا یہی حال ہے —— اس کے بعد جب علم کلام کے مختلف مذاہب بنے یا فقہ کے مذاہب وجود میں آئے تو ان کے بعد جو تفاسیر لکھی گئی ہیں۔ اگر کوئی ماتریدی ہے تو اس نے اپنے عقیدے کے مطابق

لکھی ہے، اگر کوئی اشعری ہے تو اس نے اپنے عقائد کے مطابق لکھی ہے۔ اگر کسی حنفی نے لکھی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ سارا قرآن شریف امام ابوحنیفہ کے مذہب پر نازل ہوا تھا۔ یہی حال دوسرے فقہی مسالک کے مفسرین کا نظر آتا ہے الا ماشاء اللہ۔ اور یہ سلسلہ سلف سے لے کر اب تک جاری ہے ــــ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید ان سب چیزوں سے بلند ہے۔

قرآن کی تفسیر تو اس طرح لکھی جانی چاہیے اور اس طرح سامنے آنی چاہیے کہ یہ معلوم نہ ہو کہ یہ کسی خاص علم کلام یا کسی خاص فقہی مکتب فکر کا پابند ہے۔ امام رازی کی تفسیر میں منطق اور فلسفہ کا اتنا غلبہ ہے کہ ان کی تفسیر کے متعلق یہ قول مشہور ہو گیا ہے کہ تفسیر کبیر میں سب کچھ ہے سوائے قرآن کے۔

مولانا آزاد نے اس صورت حال کا اپنے مقدمہ میں ذکر کیا ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے اکثر علماء منطق اور فلسفہ سے بڑی دلچسپی رکھتے ہیں، فقہ سے بڑا شغف رکھتے ہیں۔ حدیث سے بھی دلچسپی موجود ہے۔ لیکن اگر دلچسپی نہیں ہے تو قرآن کے معارف، اس کے عرفان، اس کی جاوداں انقلابی دعوت سے، اس کے حقیقی پیغام کی طرف التفات کم سے کم ہے، الا ماشاء اللہ۔

مولانا آزاد نے ترجمان القرآن میں اس بات کی رعایت ملحوظ رکھی کہ قرآن جو بات جس طرح جس مقام پر کہتا ہے، اسے اسی طرح مسلمانوں کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ اس سے بعض غلط فہمیاں بھی پیدا ہوئیں۔ مثلاً سورہ بقرہ میں جہاں وہ آیت ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ اس پر بڑا ہنگامہ ہوا، اور غلام احمد پرویز صاحب نے طلوع اسلام کے ذریعہ اس کو خوب اچھالا۔ چونکہ مولانا نے اس آیت کا لفظ بہ لفظ ترجمہ کر دیا تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ اگر مولانا آزاد اس کے حاشیہ میں یہ لکھ دیتے کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے بعد ایمان کا مفہوم بالکل متعین ہو گیا ہے۔ اور اب اس کا مفہوم یہ ہے۔

نجاتِ اخروی کے لیے اب آں حضورؐ پر ایمان لانا لازم، لابد اور ناگزیر ہے۔ قرآن میں اکثر جہاں بھی ایمان لانے کی دعوت ملے گی وہاں عموماً ایمان کی تفاصیل نہیں ملیں گی۔ اٰمِنُوْا میں ان تمام امور پر ایمان لانا ضروری ہوگا، جن پر جگہ جگہ قرآن ایمان لانے کی مختلف اسالیب سے دعوت دیتا ہے، لہٰذا ایمان کی تعریف ہی یہ قرار پاگئی ہے کہ اللہ پر ایمان، اس کی توحید کے ساتھ، اس کی صفات کمال پر ایمان، یوم آخرت پر ایمان، جزا و سزا پر ایمان، جنت و دوزخ پر ایمان، فرشتوں پر ایمان، وحی پر ایمان، کتابوں پر ایمان، نبوت و رسالت پر ایمان اور اس پر ایمان کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم آخری نبی اور آخری رسول ہیں، اور قیامت تک آپ ہی کی دعوتِ رسالت کا دَور جاری و ساری رہے گا ـــــ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ مولانا آزاد ان تمام باتوں کو مانتے تھے۔ لوگوں نے مولانا سے پوچھا۔ تو مولانا نے جواب دیا کہ میرا عقیدہ وہی ہے جو تمام مسلمانوں کا ہے اور وہ عقیدہ یہ ہے کہ حضورؐ کی بعثت اور قرآن کے نزول کے بعد اب نجاتِ اخروی کا دار و مدار صرف حضورؐ کا اتباع اور آپؐ کی اطاعت اور قرآن کی پیروی پر ہے۔ آپ سے پہلے کے رسولوں پر ایمان اور سابقہ کتب سماوی پر ایمان اور ان کے مطابق عمل سے اب نجاتِ اخروی نہیں ہوگی۔ پھر مولانا سے سوال کیا گیا کہ آپ نے یہاں یہ بات لکھی کیوں نہیں! تو مولانا نے جواب دیا کہ اس مقام پر آیت میں جو بات فرمائی گئی ہے میں نے اتنی بات پر ہی وہاں اکتفا کیا ہے، لیکن میں اس کو اس کے مناسب مقام پر مفصل طور پر بیان کروں گا، اور اس کی وضاحت کروں گا۔

آپ کے اسی شہر لاہور سے مولانا غلام رسول مہرؔ اور ان کے ساتھ چند دوسرے حضرات مولانا آزاد سے جاکر ملے تھے، اور اسی مسئلہ پر ان سے سوالات کیے تھے۔ مولانا آزاد نے وہی جوابات دیے تھے جن کو میں بیان کر چکا ہوں۔ یہ سوالات و جوابات "میرا عقیدہ" کے نام سے اسی زمانے سے مطبوعہ موجود ہیں۔ جس میں مولانا آزاد نے صاف لفظوں میں کہا ہے، میرا عقیدہ وہی ہے جو تمام مسلمانوں کا ہے۔

مولانا کا شاہکار "تفسیر سورۂ فاتحہ":

پھر مولانا آزاد نے سورہ فاتحہ کی جو تفسیر لکھی ہے وہ کس قدر اہم ہے۔ اس میں مولانا کی دبیت اور اندازِ خطابت عروج پر ہے۔ بلاشبہ وہ مولانا آزاد کا شاہکار ہے۔ مولانا آزاد کا ذہن و فکر امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے شاگردِ رشید امام حافظ ابن قیم علیہ الرحمۃ سے شروع ہی سے بہت متأثر تھا۔ ان دونوں ائمہ سلف کے افکار کا مولانا آزاد کے دماغ پر بڑا غلبہ تھا۔ مولانا آزاد کا جو اپنا ذاتی عظیم الشان کتب خانہ تھا، میں نے وہ کتب خانہ خود دیکھا ہے۔ اس میں علامہ ابنِ تیمیہؒ اور علامہ ابن قیمؒ کی تقریباً تمام تصانیف موجود تھیں۔ علامہ ابن تیمیہ نے سورۂ والتین اور سورۂ والعصر کی بڑی جامع اور بڑی عجیب وغریب تفسیر کی ہے۔ مولانا آزاد کے سامنے ان اکابر کے تمام اہم مباحث تھے۔ جن سے مولانا کافی متاثر تھے۔ لہذا سورہ فاتحہ کی تفسیر میں مولانا آزاد نے اللہ کی ربوبیت، اس کی رحمت اور اس کی ہدایت پر جو بحثیں کی ہیں، اگر آپ علامہ ابن تیمیہؒ کی تفسیر محولۂ بالا کو دیکھیں گے تو ان مباحث کا سررشتہ آپ کو ان کے یہاں مل جائے گا، لیکن مولانا آزاد کا اپنا خاص اسلوبِ نگارش ہے جو دل کو موہ لیتا ہے، اور اس کے مطالعہ سے ذہن و قلب پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

چند تاریخی تحقیقات

۱۔ ذوالقرنین کی شخصیت:

علاوہ ازیں مولانا آزاد نے اپنے ترجمہ میں یہ خاص بات پیشِ نظر رکھی ہے کہ جو تاریخی اہم مباحث قرآن مجید میں وارد ہوئے ہیں، ان پر مولانا نے کافی تحقیق کے بعد بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ مثلاً ذوالقرنین کون تھے؟ ذوالقرنین کے متعلق ہمارے متقدمین نے یہ لکھا ہے کہ اس سے سکندر مقدونی مراد ہے۔ حالانکہ قرآن کا معمولی طالب علم بھی بہ ادنیٰ

تامل یہ جاننا ہے کہ ذوالقرنین کے نام سے قرآن میں جس شخصیت کا ذکر کیا گیا ہے، وہ ایک خدا آشنا اور خدا ترس شخصیت تھی جب کہ سکندر مقدونی ان اوصاف سے صرف محروم ہی نہیں بلکہ ان کے بالکل برعکس اوصاف کا حامل تھا۔ مولانا آزاد نے اس مسئلہ پر بڑی دقیق تحقیق کی ہے اور بڑی تفصیلی بحث کے بعد ثابت کیا ہے کہ ذوالقرنین سکندر مقدونی ہو ہی نہیں سکتا بلکہ وہ ایران کا ایک نیک خصلت بادشاہ کیخسرو تھا۔ مولانا آزاد کی اس تحقیق پر مولانا کے ہم عصر ایک صاحب علم نے ایک مضمون لکھا اور اس پر کچھ شکوک وارد کر دیے۔ محض شکوک وارد کرنے سے تو کام نہیں بنتا۔ سوال یہ ہے کہ اگر ذوالقرنین کیخسرو نہیں ہے تو آپ کے خیال میں وہ کون سی شخصیت تھی۔ اس کے لیے آپ کی تحقیق اور دلائل کیا ہے؟ وہ یہ کام تو کر نہ سکے البتہ شکوک وارد کر دیے ——
غرضیکہ ذوالقرنین کے متعلق تحقیق مولانا آزاد کا بہت بڑا کارنامہ ہے ——

۲۔ سورۃ کہف کا ایک مقام اور اس کی تحقیق:

اسی طرح قرآن مجید میں اصحاب کہف کا ذکر آتا ہے تو وہاں دو چیزیں بہت اہم ہیں ایک تو یہ کہ جس کہف کا قرآن میں ذکر ہے وہ کہاں پر واقع ہے! قرآن نے محض کہف کو کہف کے طور پر بیان نہیں کیا بلکہ اس کی ایک خصوصیت بھی بتائی ہے کہ یہ کہف اس طرح واقع تھا کہ وہاں دھوپ نہیں آتی تھی۔ اس کی پوزیشن اس طور پر تھی۔ دوسری یہ کہ وہاں رقیم کا لفظ آیا ہے۔ اب یہاں رقیم سے کیا مراد ہے، اس میں اختلاف ہے بعض اصحاب نے یہاں تک لکھ دیا کہ اصحاب کہف کے ساتھ جو کتا تھا اس کا نام رقیم تھا۔ یہ کتنی لغو اور بے سروپا بات ہے۔ اب یہ تحقیق کرنا ہے کہ کہف کہاں تھا اور رقیم سے مراد کیا ہے! چونکہ مستشرقین قرآن مجید میں بیان کردہ ایسے واقعات کے متعلق کہہ دیتے ہیں کہ سنی سنائی باتیں اور داستانیں پیغمبرِ اسلام نے قرآن مجید میں درج کر دیں۔ ان کی تاریخی حقیقت کوئی نہیں ہے۔ تو مولانا آزاد نے اس کا بڑا اہتمام کیا کہ قرآن مجید میں تاریخی واقعات کے متعلق جو کچھ بھی آیا ہے، اسے اپنی تحقیق کے ذریعے مکمل طور پر

ثابت کریں تاکہ کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ہو کر یہ محض ہوائی باتیں ہیں۔ اس بنا پر مولانا آزاد نے کہف کے متعلق بڑی تحقیق کی۔ انھوں نے آثارِ قدیمہ کی بے شمار کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اور اپنا یہ نظریہ قائم کیا کہ اردن میں عمان کے پاس جو پہاڑیاں ہیں، ان میں بے شمار کہف یعنی غار پائے جاتے ہیں۔ ان ہی میں ایک کہف (غار) ایسا ہے جو بالکل اسی کہف کا مصداق ہے جس کا قرآن مجید میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ پھر جہاں تک رقیم کا تعلق ہے تو مولانا نے اپنی تحقیق کے نتیجہ میں لکھا ہے کہ فلاں زمانہ میں ایک پادری کو ایک ذریعہ سے ایک غار میں مٹکہ میں رکھے ہوئے کچھ کاغذات ملے تھے۔ مولانا نے ان کاغذات کی دستیابی کی پوری داستان لکھی ہے، آپ اس کو پڑھیں۔ مولانا آزاد کا کمال اصل میں یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تحقیقات اس وقت لکھی تھیں جبکہ کہف اور رقیم کے متعلق تحقیق کا کام مکمل نہیں ہوا تھا۔

اللہ کا شکر ہے کہ اب یہ تحقیقات مکمل ہوگئی ہیں جو مولانا آزاد کے نظریات کے مطابق ہیں جو مولانا نے اپنے دقیق اور تحقیقی مطالعہ سے قائم کیے تھے۔ چنانچہ اردن کے ایک بہت بڑے فاضل ہیں جو ندوۃ العلماء کے جشن میں لکھنؤ تشریف لائے تھے۔ پھر دہلی بھی آئے، مجھ سے ملاقات میں انھوں نے بتایا کہ یہ تحقیق مکمل ہوگئی ہے کہ اردن میں عمان کی پہاڑیوں میں وہ کہف موجود ہے جس کا قرآن میں ذکر ہے اور رقیم کا بھی پتا چل گیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ انھوں نے اس موضوع پر تمام تحقیقاتی کام پر ایک کتاب بھی لکھی ہے جو شائع ہو چکی ہے۔ افسوس کہ وہ کتاب تاحال میرے مطالعہ میں نہیں آئی گو انھوں نے مجھ سے کتاب بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن شاید وہ بھول گئے، بہرحال مجھے اپنے چند احباب سے تصدیق حاصل ہوگئی کہ کتاب شائع ہو چکی ہے ــــــ

مولانا آزاد کا یہ تحقیقی کام وہ چیز ہے کہ جو انتہائی قابلِ ستائش ہے۔ پھر صرف اس پہلو ہی سے نہیں بلکہ اور بھی بے شمار پہلوؤں سے مولانا آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن انتہائی قابلِ قدر خصوصیات کی حامل ہے۔

ترجمان القرآن ــــ تیسری جلد کا حادثہ :

مولانا آزاد کی اس تفسیر کے اب تک اٹھارہ پارے شائع ہوئے ہیں، بارہ پارے جو باقی رہ گئے، ان کی داستان یہ ہے کہ بعض لوگ یہ کہتے ہیں اور میں بھی ان ہی کے اندر شامل ہوں کہ مولانا آزاد نے تبلایا تھا کہ انھوں نے ان پاروں کی تفسیر مکمل کر دی ہے، میں نے یہ بات خود اپنے کانوں سے سنی ہے۔ لیکن وہ شائع نہیں ہوئی، اور اب تک یہ پتا بھی نہیں چل سکا کہ وہ کہاں ہے، مولانا آزاد کا ۲۲ر فروری ۱۹۵۸ء کو انتقال ہوا تھا اور یہ انتقال تین دن کے "کوما" (بے ہوشی) کے بعد ہوا تھا۔ مولانا کے یہ تین دن جو کوما میں گزرے تو ان میں ان کی کوٹھی میں مختلف لوگ آتے جاتے رہے۔ ان کے سامان وغیرہ کو ٹٹولتے اور دیکھتے رہے تو اندیشہ یہ ہے کہ بعض لوگوں نے مولانا کے بہت سے مسودات کو غائب کر دیا، جن میں آخری بارہ پاروں کی تفسیر بھی شامل تھی چونکہ مولانا خود فرما چکے تھے کہ انھوں نے اس کی تکمیل کر لی ہے۔ واللہ اعلم

بہر حال مولانا آزاد کی جو شخصیت ہے اور ان کے متعلق جو کچھ میں نے عرض کیا ہے، اس سے آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ وہ ایک خاص مشن کے آدمی تھے۔ ان کی دعوت وہی تھی جس کی طرف ہمارے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنی دو تقریروں میں اشارات کیے ہیں[۴] لیکن ایک تو وہ مسلمانوں سے مایوس ہو گئے،[۵] یعنی انھوں نے محسوس کیا کہ مسلمانوں میں اتنی سکت نہیں ہے کہ وہ میری تحریک کا ساتھ دیں اور اس کے ساتھ چلیں اور دوسری طرف انھوں نے یہ دیکھا کہ انگریز عالم اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے اگر اس کو ہندوستان کی حکومت سے بے دخل کر دیا جائے تو اس کی کیفیت پر کٹے پرندے کی ہو جائے گی ــــ ممکن ہے کہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد ان میں تعاون سے محرومی کا بھی احساس پیدا ہوا ہو، جس کی علمائے دیوبند کی اکثریت سے ان کو توقع ہو سکتی تھی[۶] ــــ اس لیے انھوں نے استخلاصِ وطن کی جدوجہد کو اپنی جولان گاہ بنایا ہو ــــ واللہ اعلم۔

البتہ یہ بات کہ مولانا آزاد کے پیش نظر آغاز میں تجدیدِ دین اور احیائے اسلام ہی کا کام تھا جس کے لیے قرآن مجید ہی کو انھوں نے اپنی دعوت کا مرکز و محور بنایا تھا۔ جس کا تذکرہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنی تقریر میں کیا ہے۔ اس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اس مسئلہ پہ دو رائیں ممکن ہی نہیں ہیں۔ رہی یہ بات کہ جمعیت العلماءِ ہند نے جمعیت کے اجلاس میں مولانا آزاد سے اختلاف کیا۔ جس کی طرف ہمارے ڈاکٹر صاحب نے اشارہ کیا ہے، تو میں خود تو اس اجلاس میں موجود نہیں تھا۔ لیکن میں نے جو کچھ اپنے دوستوں اور بزرگوں سے سنا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ جمعیت العلماء کا ایک جلسہ دہلی میں ۱۹۲۰ء میں ہوا تھا جس میں اس بات کی تجویز زیر غور آئی تھی کہ مولانا آزاد کو امام الہند بنا دیا جائے اور اس جلسہ میں مولانا نے بڑی پرجوش تقریر کی۔ تقریر اتنی پرجوش، ولولہ انگیز اور مدلل تھی کہ سب لوگ اس کے لیے تیار ہوگئے، لیکن ہمارے دیوبند کے اکابر میں سے مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند، دونوں اس تجویز کے حامی نہیں تھے غالباً ہمارے استاذ حضرت مولانا انور شاہ کشمیری بھی ان کے ہم نوا تھے۔ میری معلومات کی حد تک ان کے حامی نہ ہونے کی وجوہ دو تھیں:

ایک تو یہ کہ ان اکابر کے نزدیک امام الہند ہونے کے لیے صرف علم و فن، خطابت اور تحریر اور ذہانت و فطانت اور طباعی کافی نہیں ہے۔ بلکہ تقویٰ اور طہارت بھی ہونی چاہیے۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ مولانا آزاد کا باوجود اپنے علم و فضل کے تقویٰ و طہارت میں وہ مقام نہیں تھا جو ہمارے علمائے دیوبند اور ہماری دوسری دینی درس گاہوں کے مشائخ کا تھا۔ صاف بات یہ ہے کہ مولانا آزاد کو اس بات کا احساس و ادراک ہی نہیں تھا اگر ہوتا اور وہ سجادہ نشین ہو کر بیٹھ جاتے تو آپ دیکھتے کہ ان کے والد سے سوگنا زیادہ لوگ ان کے مرید ہو جاتے چونکہ ان کے والد ماجد میں خطابت نہیں تھی، ادبیت نہیں تھی، خاص علمیت نہیں تھی، جب کہ اللہ نے مولانا آزاد کو اس سے خوب نوازا تھا لیکن انھوں نے اس راستے کو اختیار ہی نہیں

کیا۔ پھر یہ کہ ان کا ظاہر و باطن یکساں تھا مثلاً وہ سگریٹ پیتے تھے تو یہ نہیں کہ چھپ کر پئیں۔ سب کے سامنے پیتے تھے۔ ظاہر بات ہے کہ تقویٰ کے اعتبار سے مولانا کا کوئی خاص مقام نہیں تھا۔ لہٰذا ہمارے چند علماء نے ان کے امام الہند بنانے کی حمایت نہیں کی تو اس کی پہلی وجہ یہ تھی کہ اس کے لیے تقویٰ وطہارت کی بھی ضرورت ہے اور مولانا آزاد میں اس کی کمی تھی۔

دوسری بات یہ کہ علماء متردد تھے کہ ان حالات میں کیا واقعی امام الہند کا منصب قائم کرنا چاہیے! اس لیے کہ ان کے نزدیک امام وہ ہو سکتا ہے جس کے ہاتھ میں قوتِ تنفیذ ہو۔ یعنی محض زبانی بنا دینے سے تو کوئی امام نہیں ہو جاتا۔ ایسے شخص کو آپ اپنا رئیس، سردار کہہ سکتے ہیں۔ لیکن امام تو خلیفہ کے مترادف منصب ہے، اور جب تک قوت تنفیذ نہ ہو، کسی کو امام قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ غلام ہندوستان میں اگر مولانا کو امام بنا دیا تو اس کا مقام وہی ہوگا جیسے ایک لیڈر کا ہوتا ہے لیکن اسلام میں امام کا جو مفہوم ہے وہ تو ادا نہیں ہوگا لہٰذا مولانا کو امام الہند بنانے کی تجویز عملی صورت اختیار نہ کر سکی ــــ مولانا معین الدین اجمیری کے متعلق جو بات سامنے آئی ہے اس کا مجھے علم نہیں ہے۔ لیکن اگر مولانا نے ایسی بات کہی بھی ہو تو کچھ زیادہ عجیب نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے منطقی اور فلسفی تھے آپ جانتے ہیں کہ جو لوگ منطقی اور فلسفی ہوتے ہیں وہ بات کہنے میں زیادہ محتاط نہیں ہوتے۔ بسا اوقات وہ ایسی بات بھی کہہ جاتے ہیں جو ان کو کہنی نہیں چاہیے۔ اگر انھوں نے کوئی ایسی بات کہی ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

انسانی عظمت اور مخالفت کی کسوٹی:

پھر ایک بات، اور وہ یہ کہ دنیا میں اگر کسی شخص کا کوئی مخالف نہیں ہے تو سمجھ لیجیے کہ وہ بڑا آدمی ہے ہی نہیں۔ کوئی شخص بڑا آدمی اس وقت بنتا ہے جب کچھ لوگ اس کے مخالف ہوں۔ یہ تو لازمی بات ہے۔ بڑا آدمی وہی ہوتا ہے جو عام ڈگر سے

ہٹ کر کوئی نئی راہ پیش کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ یہ راستہ جس پر لوگ اندھا دھند چلے جارہے ہیں، اس میں آگے کتنے خطرات ہیں۔ وہ دیکھتا ہے کہ مستقبل میں کیا ہونے والا ہے، کیا پیش آنے والا ہے، کیسی آندھی آنے والی ہے۔ وہ ان کو دیکھ کر قوم کو خبردار کرتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایسے شخص کو ایک نئی راہ اختیار کرنی ہوگی، نیا اسلوب اپنانا ہوگا۔ اس وقت کے جو عوام ہوتے ہیں وہ اس کے متحمل نہیں ہوتے۔ اس لیے ان کے دلوں میں بیزاری پیدا ہوتی ہے لیکن جو لوگ زیادہ سمجھ دار ہوتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ داعی کتنی دور کی بات کہہ رہا ہے۔ وہ اپنے مستقبل میں کیا دیکھ رہا ہے۔ وہ اس کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ایک قافلہ بننا شروع ہو جاتا ہے، اور وہ قافلہ ابتدا میں چھوٹا ہوتا ہے لیکن اگر استقامت سے دعوت کا کام جاری رکھا جائے۔ اور مخالفتوں سے دل برداشتہ ہو کر ہمت نہ ہاری جائے اور اپنے موقف پر داعی ڈٹا رہے، اور اپنی دعوت پیش کرتا رہے، اور لوگوں کو تجربہ ہو کہ جس دعوت کو لے کر یہ لوگ اٹھے ہیں اس میں یہ مخلص ہیں اور یہ دعوتِ حقہ ہے تو اگر داعیوں میں استقلال اور ثابت قدمی ہو تو دعوت پھیلتی ہے، اور قافلہ بڑھتا جاتا ہے یہ عام قاعدہ ہے۔ تو حقیقت یہ ہے کہ مولانا آزاد نے جب یہ محسوس کیا کہ جو اصل دعوت ان کے پیش نظر ہے، اس کے لیے ابھی حالات سازگار نہیں ہیں تو انھوں نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ لیکن وہ بھی نہ صرف مسلمانانِ ہند کے مفاد میں تھا بلکہ پورے عالمِ اسلام کے مفاد میں بھی تھا اس لیے کہ انگریز کے پنجۂ استیلاء میں تقریباً پورا عالمِ اسلام بالواسطہ یا بلاواسطہ گرفتار تھا۔ ہندوستان میں انگریز کی حکومت کے خاتمے کا مطلب یہ تھا کہ اس کی گرفت کمزور ہو جائے اور دوسرے مسلمان ممالک بھی اس کی سیاسی و عسکری غلامی سے نجات حاصل کر سکیں۔

ایک نکتۂ حکمت:

مولانا آزاد کے نقادوں نے مولانا کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے۔ اس ضمن میں

اصولی بات میں عرض کر دوں گا۔ وہ یہ کہ قرآن مجید فرماتا ہے کہ اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّئَاتِ "نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں" ـــــ مجھے بتایا جائے کیا کوئی آدمی ایسا ہے جو سراپا نیکی ہو۔ سراپا تقویٰ و طہارت ہو جس کے اندر اس کے منافی کوئی چیز نہ ہو۔ اگر یہ ہے تو قرآن نے جو کہا ہے کہ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا۔ تو اس کا کیا حل ہو گا! اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ اس میں صرف تقویٰ پیدا کیا گیا ہے۔ فجور کا داعیہ پیدا نہیں کیا گیا۔ انسان کا کمال تو یہ ہے کہ فجور کا میلان ہو لیکن انسان شعوری طور پر اس سے بچنے کی کوشش کرے۔ اس لیے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلّم نے وسوسۂ نفس پر کوئی قدغن نہیں لگائی۔ صحابۂ کرامؓ نے کہا کہ حضورؐ ہمارے نفس میں گناہوں کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ تو حضورؐ نے فرمایا کہ ایسا ہونے پر کوئی مضائقہ نہیں۔ اس کے صدور سے بچنے کی کوشش کرو ـــــ میں عرض کرتا ہوں کہ اگر گناہ کی طرف آپ کے دل میں رغبت بھی پیدا نہ ہو تو آپ انسان نہیں فرشتے ہیں۔ انسان کو فرشتوں پر جو فضیلت حاصل ہے وہ اسی وجہ سے ہے کہ فرشتے تو اختیار و ارادہ رکھتے ہی نہیں۔ وہ تو مشین ہیں یا اس کے پرزے ہیں، لہٰذا ان کو جس کام پہ لگا دیا گیا ہے وہ اس کام کو انجام دے رہے ہیں۔

اس کے برعکس انسان کے اندر ارادہ ہے۔ اس کو اختیار بخشا گیا ہے۔ اس کے نفس میں تقویٰ اور فجور الہام کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود وہ صحیح راستہ پر چل رہا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے جہاد کیا۔ وہ کشمکش سے دوچار ہوا ہے اس نے فجور کو چھوڑ کر تقویٰ کی روش اختیار کی ہے تو یقیناً اس کا مقام بہت بلند و ارفع ہو گا۔

ایک شخص لکھ پتی اور کروڑ پتی ہے اور وہ کہتا ہے کہ میں نے کبھی شراب کو ہاتھ تک نہیں لگایا تو یقیناً وہ بہت زیادہ قابلِ تعریف ہے۔ لیکن ایک شخص جو نانِ شبینہ کا محتاج ہے وہ مونچھوں پر تاؤ دے کر کہتا ہے کہ میں نے کبھی شراب نہیں پی تو ٹھیک ہے کام بہت اچھا ہے لیکن وہ اتنا قابلِ تعریف نہیں ہے جتنا ایک مالدار

شراب سے مجتنب سمجھا جائے گا۔ ایک شخص جو جوان ہے۔ تندرست اور بڑا خوبصورت ہے وہ یہ کہتا ہے کہ الحمد للہ میں نے آج تک کسی عورت کی طرف بری نگاہ سے نہیں دیکھا یقیناً یہ نوجوان نہایت قابلِ تعریف ہے لیکن ایک نابینا یہ کہتا ہے کہ میں نے آج تک کسی عورت کو بری نگاہ سے نہیں دیکھا تو اس نے کونسا تیر مارا۔ تو زندگی کا یہ فلسفہ ہے۔

پس اس بنا پر ہمیں ہر بڑے شخص کو اس طرح نہیں دیکھنا چاہیے کہ گویا وہ فرشتہ ہے۔ یہ تو صرف رسولوں کا خاصہ ہے۔ کہ وہ بالکل معصوم ہوتے ہیں۔ پھر ہمارے صحابہ کرامؓ کی خصوصیت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے فیضِ صحبت نے ان کو اس مقام پر پہنچا دیا تھا کہ انھوں نے نفس کے بے قابو گھوڑے کے منہ پر لگام ڈال رکھی تھی، لہٰذا ہمیں ہر بڑے شخص کو سنجیدگی کے ساتھ اس نگاہ سے دیکھنا چاہیے کہ کسی بڑے شخص میں اچھی چیزوں کا تناسب کیا ہے! اگر ان کا غلبہ ہے تو ان کی چھوٹی چھوٹی لغزشوں کو نظر انداز کر دینا چاہیے۔

حاشا و کلا اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ مولانا آزاد میں کسی نوع کا فجور تھا۔ معاملہ صرف اتنا ہے کہ ہمارے صاحبِ دل اور صاحبِ حال علمائے کرام کے نزدیک تقویٰ کا جو معیار ہے، مولانا آزاد اس معیار پر پورے نہیں اترتے تھے، اور ان علمائے کرام کے نزدیک امام الہند کے منصب پر فائز شخصیت میں معیاری تقوی ضروری ہے، دوسرے یہ کہ ان کی رائے میں "امام" ایک ایسی دینی اصطلاح ہے کہ جس کے ہاتھ میں قوت تنفیذ ہونی ضروری ہے۔ اسی لیے جمیعت العلماء کے اجلاس میں مولانا آزاد کو باقاعدہ امام الہندؒ قرار دینے کی تحریک کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔

حرفِ آخر:

حاصل گفتگو یہ ہے کہ مولانا ابو الکلام آزاد ہماری ملتِ اسلامیہ کے بڑے قابلِ قدر اور نابغہ روزگار شخصیت تھے۔ انھوں نے برصغیر کے مسلمانوں کی جو خدمات انجام دی ہیں، وہ پورے عالم اسلام کے لیے بھی قابلِ قدر ہیں۔ لہٰذا ہمیں دعا کرنی چاہیے کہ

اللہ تعالیٰ ان کو ان کے اعمالِ حسنہ کی جزا عطا فرمائے۔ ان کی لغزشوں کی مغفرت فرمائے اور انھیں جنت میں مقام علیین پر فائز فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین ٥

(ماہنامہ حکمت قرآن، لاہور۔ اگست ۱۹۸۴ء)

حواشی

لہ اس مقام پر مولانا اکبرآبادی کو ایک دوسرے واقعے سے التباس ہو گیا۔ سرڈینی سن کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا تھا، وہ "راگ درپن" کے ایک مخطوطے کے مطالعہ و فہم کے سلسلے میں تھا۔ مولانا آزاد نے غبار خاطر کے اُس خط میں جو موسیقی کے ذوق کے تذکرے میں ہے، اس واقعے کا ذکر فرمایا ہے، یہ دوسرا واقعہ ہے۔ اس کا ذکر مولانا نے نیشنل لائبریری کلکتہ کی افتتاحی تقریر (یکم فروری ۱۹۵۳ء) میں کیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

"جب نیشنل لائبریری کی کونسل نے مجھے دعوت دی کہ میں لائبریری کی نئی عمارت میں اس کا افتتاح کروں تو میرے حافظے میں قدرتی طور پر اب سے ۴۸ سال پہلے کے ایک واقعے کی یاد تازہ ہو گئی جب میں پہلی بار اس لائبریری میں داخل ہوا تھا۔ یہ ۱۹۰۴ء کا واقعہ ہے، اس وقت میں صرف ۱۶ سال کا ایک لڑکا تھا۔ میری تعلیم ختم ہو چکی تھی اور قدیم تعلیمی نظام کی روایت کے مطابق مشق اور استعداد بہم پہنچانے کے لیے مختلف مضمونوں کے طلبہ کی ایک جماعت کو میں نے پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ لائبریری کے بوہار کلیکشن میں البیرونی کی مشہور تصنیف "القانون" کا ایک نادر مخطوطہ ہے۔ یہ سن کر میں نے اپنے ایک دوست مرزا فضل الدین احمد کے ساتھ، جنھوں نے بعد میں میری کتاب "تذکرہ" شائع کی تھی، یہاں آیا تھا۔ آپ کو یاد ہو گا اس وقت یہ لائبریری "امپیریل لائبریری" کے نام سے مشہور تھی اور میٹکاف ہال میں قائم تھی۔

لائبریری سے استفادے کے لیے پہلے ایک اجازت نامہ حاصل کرنا پڑتا تھا۔ مرزا فضل الدین اپنے لیے یہ اجازت نامہ حاصل کر چکے تھے لیکن جب انھوں نے میرے لیے اجازت نامہ حاصل کرنا چاہا تو لائبریری اسسٹنٹ نے مجھے بڑے غور سے دیکھا اور میری عمر دریافت کی۔ میں نے کہا میری عمر تقریباً ۱۶ سال ہے۔ یہ سن کر اس نے مجھے اجازت نامہ دینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ۱۸ سال سے کم عمر کے کسی لڑکے کو اجازت نامہ نہیں مل سکتا۔

مرزا فضل الدین نے ہر چند اسے مطمئن کرنا چاہا اور کہا کہ اگرچہ ان کی عمر یہی ہے لیکن یہ منطق، فلسفہ اور فقہ کے ایک استاد ہیں۔ اس لیے انھیں لائبریری سے استفادے کی اجازت ملنی چاہیے۔ اور اگر ۱۸ سال سے کم عمر کے کسی نوجوان کے لیے لائبریری سے استفادے کی اجازت نہیں ہے تو انھیں اس قاعدے سے مستثنیٰ قرار دیا جانا چاہیے، میں نے لائبریری اسسٹنٹ کو دیکھا اور محسوس کیا کہ وہ اس بیان کی صحت تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ مرزا فضل الدین نے لائبریرین سے ملنا چاہا لیکن بدقسمتی سے وہ اس وقت موجود نہیں تھے۔ لائبریری میں داخلے کی یہ میری پہلی کوشش تھی جسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا اور مایوس ہو کر لوٹ گیا تھا۔

چند سال کے بعد جب میرے ایک فاضل دوست ہری ناتھ دے لائبریرین ہوئے تو میرے لیے اس لائبریری سے استفادے کی رکاوٹ دور ہو گئی، اور میں نے اس کے علمی ذخیرے سے بہت استفادہ کیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ قاعدہ بعد میں رہا یا نہیں لیکن میرے لیے اس لائبریری کی نہ صرف نادر کتابوں بلکہ بہت قیمتی مخطوطوں کے حصول میں بھی کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی۔ میں جب تک کسی چیز کو اپنے پاس رکھنا چاہتا، رکھتا اور جو چاہتا نقل کر لیتا۔ میں بہت خوش ہوں کہ مجھے اس لائبریری کے افتتاح کا اعزاز حاصل ہوا ہے، اور اس کے دروازے جو اب سے ۴۸ سال پہلے میرے لیے بند تھے، علم و ادب کے تمام شائقین کے لیے کھول دیے جا رہے ہیں۔"

(البیرونی اور جغرافیۂ عالم از مولانا ابوالکلام مرتبہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری، پاکستانی ایڈیشن ص ۱۰۹)

۲ھ خدا کے تصور کے نشو و ارتقا کے مسئلے پر مولانا نے ترجمان القرآن جلد اول تفسیر سورۂ فاتحہ میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ یہی مسئلہ ایک خاص انداز سے غبار خاطر کے مکتوب مورخہ ۱۷ اکتوبر و ۱۸ اکتوبر ۱۹۴۲ء میں زیر بحث آیا ہے۔ خصوصاً ۱۸ اکتوبر کے مکتوب میں خدا کے شخصی (پرسنل گاڈ) کے تصور اور اس کے درجات پر روشنی ڈالی ہے۔

۳ھ حزب اللہ میں شمولیت کے لیے تو فارم رکنیت پُر کرنا پڑتا تھا لیکن جب مولاناؒ نے مسلمانوں کے تنظیم و اجتماع کی تحریک شروع کی تو وہ عازم کار سے خدمتِ حق کا عہد لیا کرتے تھے۔ یہی بیعت تھی۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "تحریک نظمِ جماعت" از ابوسلمان شاہجہان پوری

۴ھ مولانا آزاد نے سب سے پہلے فروری ۱۹۲۰ء میں کلکتہ کے صوبائی مجلس خلافت کے جلسے میں "مسئلہ خلافت" کے موضوع پر یہ معرکہ آرا تقریر کی تھی۔ پھر دوسرے مقامات پر مختلف خلافت کانفرنسوں میں انھی مطالب کا اعادہ کیا۔ مولانا کی یہ تقریر خلافت کمیٹی نے کلکتہ سے شائع کر دی تھی۔ اس کا عنوان تھا "مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب" بعد میں مولانا نے اس میں بعض مطالب کا اضافہ کیا تھا جو "مسئلہ خلافت" کے نام سے چھپی۔ اب تک اس کے ہندوستان پاکستان سے بیسیوں ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ مولانا غلام رسول مہر اس کے بہت قائل تھے اور فرماتے تھے کہ اس موضوع پر اس سے بہتر اور جامع تصنیف کوئی اور نہیں۔

۵ھ دو باتیں ہیں اور دونوں کے الگ الگ محل ــــ ایک ہے جمعیت کے تنظیمی کاموں، تحریکوں اور اس کے اجلاسوں میں سرگرمی سے حصہ نہ لینا، شاید یہ بات کسی درجے میں درست ہو۔ دوسری بات ہے جمعیت کی دعوت اور مقاصدِ ملّی سے عدم دل چسپی اور سرد مہری کی ــــ تو اس کی صحت محلِ نظر ہے۔ خالص ملّی مقاصد کے پیشِ نظر اربابِ جمعیت سے مولانا کے تعلقات کبھی سرد مہری کا شکار نہیں ہوئے، ان میں ہمیشہ سرگرمی موجود رہی۔ انھی ملّی مقاصد کے پیشِ نظر اربابِ جمعیت کے واسطے سے جمعیت علمائے ہند سے مولانا آزاد کا تعلق ہر دور میں بہت قریبی اور مستحکم رہا۔ مسلمانوں کے تعلیمی، سماجی، دینی، اصلاحی کاموں میں رہنمائی کے لیے جمعیت علما مولانا آزادؒ کے افکارِ ملّی کی زندہ و متحرک تصویر تھی۔ اگرچہ سیاسی کاموں کے لیے مولانا نے اس دور میں صرف کانگریس کے غیر فرقہ وارانہ پلیٹ فارم کو استعمال کیا لیکن ملّی نقطۂ نظر سے حالات وقت کے مطابق تحریک و احتجاج کے لیے جمعیت کو ایما فرماتے تھے۔ لیکن یہ بحث مولانا کے اصولِ تقسیمِ کار و طریقِ رہنمائی سے متعلق ہے۔

یہ موقع تفصیل و وضاحت کا نہیں۔

۶ یہاں مسئلہ اس احساس کا بالکل نہیں۔ یہ دعوت کا ایک مرحلہ تھا جو گزر گیا۔ ہند پاکستان کی تاریخ میں اس قسم کے کئی مرحلے نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ اٹھارھویں صدی میں حضرت شاہ ولی اللہ کی دعوت الی القرآن ایک مرحلہ تھا اور ایک وقفے کے بعد ان کے ابنائے گرامی کی سرگرمیاں دوسرا مرحلہ تھا۔ شاہ عبدالعزیز کے بعد حضرت شیخ الہند کی ذات گرامی سے تیسرے مرحلے کا آغاز ایک طویل مدت کے بعد ہوا۔ شاہ اسمٰعیل شہید کی دعوتِ تمسک بالکتاب والسنۃ کے بعد علم و عمل کی ویسی جامع تحریک ایک مدت تک پیدا نہ ہو سکی۔ یہ دعوت کے ناگزیر مرحلے تھے۔ ان کے درمیانی وقفوں کو جب کہ دعوت میں تسلسل نظر نہ آئے، دعوت کی ناکامی اور داعیان گرامی اور ان کے جانشینوں کی مایوسی کا دور قرار نہیں دیا جا سکتا۔

مولانا آزاد، مولانا عبیداللہ سندھی، شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوری ایک ہی عہد میں قرآن کے داعی تھے جو اپنا اپنا انداز رکھتے تھے۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ان حضرات میں سے بعض نام نظر انداز کر کے مو. سید ابوالاعلیٰ مودودی کا ذکر کرتے ہیں، حالانکہ آں مرحوم کا مقصد اور نصب العین دوسرا تھا۔ ان کے جانشینوں میں آج کوئی بھی اس کام کے لیے وقف نہیں، پھر کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآنی دعوت ناکام ہو گئی ہے۔ دراصل یہ دعوت کے مختلف مرحلے تھے، جن کا پیش آنا ناگزیر تھا۔ دعوت قرآنی ہر دور میں زندہ رہی خواہ اس کے خصائص کبھی دھندلا گئے ہوں اور ہمیں نظر نہ آئیں۔ مولانا آزاد اس کے نتائج سے کبھی مایوس نہیں ہوئے، اور نہ اس جادۂ حق اور دعوت قرآنی کو کبھی ترک کیا، لیکن ان کا انداز بدل گیا۔ اس انٹرویو میں مولانا اکبر آبادی نے فرمایا ہے کہ وجود باری تعالیٰ پر اور مذہب کی ضرورت اور اسلام کی حقانیت پر مولانا آزاد نے دو گھنٹے تک تقریر فرمائی، دلائل سب قرآنی تھے لیکن قرآن کا حوالہ اس میں کہیں نہ آیا تھا، آخر یہ کیا ہے؟ میرے نزدیک حکمتِ قرآنی اور موعظۂ حسنہ کی ایک نادر مثال۔

دعوت قرآنی کی رہنمائی کے لیے مشیّتِ الٰہی ہمیشہ سروسامان کار اور اشخاص پیدا کرتی رہی ہے۔ ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ آئندہ بھی ایسے اصحابِ ذوق اور عازم وقت پیدا کرے جو دعوت کی اگلے مرحلے میں رہنمائی کریں۔ لیکن اگر ان کے دعویِ خدمتِ قرآن کے باوجود ان کا رخ خالصتاً اسی طرف رہنے کے بجائے تنظیم اسلامی، عوام ملت کے دیگر مسائل کی طرف بھی ہو تو کیا یہ کہا جائے گا کہ دعوتِ رجوع الی القرآن کی ناکامی کے خیال نے اس طرف ان کی رہنمائی کی ہے یا دعوت کے خاطر خواہ نتائج سے مایوسی نے ان کے قلب کی جمعیت اور ارادہ کے [illegible]

بھونجر مارا ہے؟

کسی بھی دعوت کا مختلف نشیب وفراز سے گزرنا لازمی ہوتا ہے۔ وقت کے شدائد اور حالات کی سنگینی کا اثر بھی ہوتا ہے، اور بعض اوقات اس حد تک کہ حکومت الٰہیہ کے نصب العین سے ذرا بھی اِدھر اُدھر ہونے کو "شرک فی الصفات" سمجھنے والی جماعتِ اسلامی بھی خالص مغربی طرز کی جمہوریت کے قیام کے مطالبے میں شریک ہوتی ہے۔ لیکن اس کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ خالص اسلامی دعوت اور حکومت الٰہیہ کے قیام سے مایوس ہوگئی ہے، شاید بڑی جسارت ہوگی۔ حالانکہ وقت کے کئی اکابر اب اسی انداز میں سوچتے ہیں۔

خود مولانا اکبر آبادی نے اسی تقریر میں فرمایا ہے کہ کانگریس میں اعلیٰ مقام پر فائز ہونے کے باوجود مولانا نے مسلمانوں کے حقوق اور اسلام کے مفادات کو کبھی نظر انداز نہیں کیا، اور قرآن مجید کے انقلابی فکر کو اجاگر اور مہمیز کرنے والے ترجمہ قرآن اور اس کے حواشی پر برابر کام کرتے رہے۔

۵۷ فروری ۱۹۵۸ء میں مولانا آزاد کا انتقال ہوا۔ اس وقت تک ہندوستان پاکستان کے تعلقات جو اچھے رہے تھے، اس میں زیادہ حصہ حضرت مولانا ہی کے مساعی کا تھا۔ مولانا کے انتقال سے وہ دستِ رہنما نظروں سے اوجھل ہوگیا جو حالات کی خوش گواری کا ضامن تھا۔

۵۸ یہ تقاریر 'جہاد بالقرآن' اور 'اسلامی انقلاب کے لیے التزام جماعت اور مسئلہ بیعت' کے عنوانات سے شائع ہو چکی ہیں۔ (مرتب)

۵۹ اس سلسلے میں دو باتیں عرض کرنی ہیں:

الف: مولانا سعید احمد اکبر آبادی جس مزاج اور طبیعت کے انسان، ان سے بعید تھا کہ وہ مولانا آزاد کے بارے میں اس قسم کا دو ٹوک الفاظ میں فیصلہ صادر فرمادیں۔ مجھے یقین ہے کہ مرتب سے اس مقام پر لطائف بیان میں تسامح ہوا۔

ب: جب تک ملک کی سیاسیات میں فرقہ وارانہ تعصبات کا زہر نہیں گھولا گیا تھا، مولانا آزاد مسلمانوں کے ایک مسلّمہ لیڈر تھے اور فرقہ وارانہ سیاست کا دور بہت بعد میں آیا۔ لیکن اس وقت بھی کہ پورا ملک مولانا آزاد کے فرمودات کے لیے ذوق پذیرائی سے معمور تھا، انھوں نے عوام کے قبول واستقبال کی پرواکب کی تھی جو ایک مختصر دور میں عوام کے نفور واستکراہ اور عدم پذیرائی یا کسی اور وجہ سے مایوس ہو جاتے۔ ملک کی آزادی کے بعد تو ہندوستان میں وہ نہ صرف ایک مسلّمہ

لیڈر" تھے بلکہ بے شائبہ خوفِ اختلاف مسلمانوں کے" واحد رہنما" تھے، لیکن انھوں نے اس وقت بھی عوامی زندگی پر گوشہ نشینی اور خاموشی کو ترجیح دی۔ یہ بات مولانا کے ذوق و مزاج کے ساتھ ان کے اصول تقسیم کار، مصالح ملی اور تقاضائے وقت سے تعلق رکھتی ہے مسلمانوں سے مایوس ہو جانا کوئی مسئلہ نہیں۔

لیکن جہاں صحتِ ذوق و فکر اور ردّ و قبول کا معیار یہ ہو کر اگر مولانا آزاد مسلمانوں کے بہی خواہ تھے اور ہندوستان میں اسلام کی سربلندی چاہتے تھے تو مسلم لیگ یا جماعت اسلامی میں کیوں نہ شامل ہو گئے تھے اور اگر وہ پاکستان کی ترقی واستحکام چاہتے تھے تو پاکستان کیوں نہ آ گئے تھے، وہاں مولانا کے کسی رویّے اور فیصلے کے حقیقی پس منظر اور واقعی اسباب کی جستجو کون کرے!

ن اس سلسلے میں بھی دو باتیں عرض کرنی ہیں:

الف: اگر مرتب کے قلم نے تالیف بیان وخطاب میں کوتاہی نہیں کی تو یہ مولانا اکبر آبادی کے قیاسات ہیں۔ اگرچہ قیاس کا مولانا کو حق ہے لیکن سوانح و واقعات میں قیاس کا مقام قیاس و وہم ہی کے درجے میں ہوتا ہے۔

ب: بشرطیکہ یہ ثابت کر دیا جائے کہ مولانا آزاد کو علمائے دیوبند سے کوئی توقعات تھیں۔ میرا خیال ہے کہ عام علمائے دیوبند بھی اپنی رجعت پسندی، بے عملی، عدم احساسِ مسائلِ مہمہ، اعراضِ عزیمتِ دعوت، انکار ایثار جان ومال، عدم استعدادِ تحمل شدائد، حبِّ دنیا اور ذوقِ عیش کوشی میں ملک کے عام علماء و مشائخ، اصحابِ جبہ و دستار، عزلت نشینان اور سرمست بادۂ عرض و نیاز سے کسی طرح پیچھے نہ تھے۔ اس عام ذوق و روش سے حضرت شیخ الہند کے استثناء کے علاوہ آپ ہی کے فیضان تعلیم و تربیت سے ایک مختصر جماعت دعوتِ عزیمت پر لبیک کہنے کے ذوق سے سرشار اور آمادہ ایثار پیدا ہو گئی تھی۔ اصحابِ عزائم کی یہ مختصر جماعت حضرت شیخ الہند کے بعد بھی مولانا آزاد کی گرویدہ وجاں نثار اور معین و مددگار رہی۔ اس نے آزادی کی جدوجہد میں وقت و مال وجان کی بے مثال قربانیاں دیں۔ مسلمانوں کے دینی، تعلیمی، ثقافتی مسائل کے تصفیے اور اجتماعی زندگی کے بقاو قیام میں، آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد عظیم الشان خدمات انجام دیں۔ مولانا آزاد کو اس جماعت کا نہ صرف تعاون حاصل تھا بلکہ وہ اس کے لیڈر تھے۔

یقین رکھنا چاہیے کہ مولانا کے قلب پر ان کے تعاون سے محرومی کا کوئی داغ نہ تھا۔

سلہ ان حضرات، اور کئی دوسرے حضرات کی مخالفت کا پس منظر، اس سے قطعی مختلف تھا۔ لیکن اس قضیۂ نامرضیہ کو چھیڑنے کا یہ موقع مناسب نہیں۔ حضرت انور شاہ کاشمیری کا اس مخالفت سے کوئی تعلق نہ تھا۔

سلہ حضرت مولانا اجمیری کے اخلاق کے بارے میں یہ محض "سوءِ ظن" ہے کہ انھوں نے مولانا آزاد کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ "ایاز قدرِ خود بشناس" فلسفی اور منطقی اپنے اظہارِ خیال میں خواہ کتنے ہی غیر محتاط ہوتے ہوں، لیکن بدتہذیبی اور اخلاق کی پستی کا الزام تو ان پر خصوصاً حضرت مولانا اجمیریؒ پر نہیں لگایا جا سکتا۔ ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ دورِ گذشتہ علم و تہذیب میں ہمارے بزرگوں کے اخلاق اس سے بہت بلند تھے۔ حکیم سید محمود احمد برکاتی نے اپنے ایک مراسلے میں مولانا اجمیریؒ سے اس پستی کی نسبت کی تردید کی ہے۔

ترجمان القرآن

مولانا ابو الکلام آزاد نے اُردو ادب کے چمن میں حسنِ انشا و بیان کے جو پھول کھلائے ہیں یوں تو وہ سب ہی سدا بہار ہیں لیکن ۔

" مستقل تصنیف کی حیثیت سے قرآن مجید کی تفسیر ترجمان القرآن مولانا کی تمام علمی اور ادبی تحریروں میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ قلم کی توانائی، اجتہادِ فکر، وسعتِ نظر، مطالعہ اور جذبۂ تحقیق و تدقیق، مولانا کی یہ وہ خصوصیات ہیں جو ان کی ہر علمی اور ادبی تحریر میں نظر آتی ہیں۔ لیکن مولانا کی یہ خصوصیات جس کتاب میں جا بجا نمایاں ہیں اور اس بنا پر اُردو زبان کے علمی ذخیرے میں اس کو امتیازی مقام حاصل ہے۔"

عربی فارسی اور اردو میں سیکڑوں تفسیریں لکھی جا چکی ہیں لیکن ان کا عام رنگ یہ ہے کہ ایک آیت کی تشریح و توضیح میں یا اس سے مستخرج احکام کے بارے میں متقدمین مفسرین کے جو مختلف اقوال منقول ہیں ان سب کو نقل کرتے چلے جاتے ہیں اور ساتھ ہی اُن اقوال میں سے ہر ایک کی دلیل بھی بیان کر دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اربابِ علم ان سے استفادہ کر لیں تو کر لیں۔ لیکن عام لوگوں کا دماغ ان میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔ اور قرآن کا جو مقصد ہے یعنی کسی حقیقت کو ذہن نشین کر کے اس کا یقین پیدا کر دینا وہ حاصل نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں ہر مفسر کوشش کرتا ہے کہ وہ فقہ یا علم الکلام کے جس مسلک سے تعلق رکھتا ہے اس کو قرآن کی آیات سے ثابت کرے اور دوسرے مسلک کے لوگوں کی تردید میں ان سے استدلال کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قرآن کی تفسیر تاویل و توجیہ کا ایک ایسا باب کھل جاتا ہے کہ قرآن کی عمومیت، اس کی جامعیت اور اس کی بے قید و بند تعلیمات محدود ہو کر رہ جاتی ہیں اور قرآن فقہی اور کلامی بحثوں کا میدان بن جاتا ہے۔

" مولانا نے اس عام روش کے خلاف بالکل ایک نیا طریقہ اور نیا اسلوب اختیار کیا

حوالہ: ماہنامہ آجکل دہلی، مولانا ابو الکلام آزاد نمبر ۱۹۵۸ء

ہے جو قرآن کی عمومیت کے ساتھ ہم آہنگ ہے ۔مولانا عربی زبان اور اس کے اسالیب بیان، صحابہ کرام کے اقوال اور قدما مفسرین کی تشریحات و توضیحات کی روشنی میں کامل غور و خوض کے بعد قرآن کی آیت کا ایک مطلب معین کر لیتے ہیں اور اس کو کمال قوت و بلاغت کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں۔"

اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ قاری کے ذہن میں اضطراب و تشویش کی کوئی کیفیت پیدا نہیں ہوتی اور قرآن کے حقائق و مطالب دل میں اُترتے چلے جاتے ہیں ۔

عام تفسیروں کی ایک دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ان میں بقول مولانا کے "وضعیت" پائی جاتی ہے ۔اس سے مراد یہ ہے کہ زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ جو جو علوم و فنون پیدا ہوتے رہے اور عام انسانی افکار و خیالات پر ان کی گرفت مضبوط ہوتی رہی ۔قرآن کی تفسیر میں بھی اس کے اثرات نمایاں ہوتے رہے ۔چناں چہ امام فخر الدین رازی کی مشہور تفسیر کبیر کی نسبت کہنا پڑا کہ اس میں منطق، فلسفہ و حکمت، علم الکلام وغیرہ سب کچھ ہے مگر قرآن نہیں ہے ۔ہمارے زمانے میں اس کی سب سے بڑی مثال مصر کے علامہ جوہری طنطاوی کی ضخیم تفسیر جواہر القرآن ہے جس نے قرآن کو سائنس کے علوم و فنون کا ایک ذخیرہ بنا دیا ہے ظاہر ہے یہ وضعیت یا صناعیت قرآن کی اس سادگی اور فطریت کے بالکل خلاف ہے جو اس کی ہر آیت میں نمایاں ہے ۔قرآن اگرچہ عقل کو نظر انداز نہیں کرتا لیکن اس کا عام طریقہ استدلال وجدانی ہوتا ہے جس کو ہر شخص خواہ عالم ہو یا جاہل محسوس کرتا ہے اور اسی وجدانیت کے ذریعہ ہدایت اور اصلاح کا وہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے جس کے لیے دنیا میں پیغمبر آتے رہے اور جس کے لیے خود قرآن کا نزول ہوا۔

اس سلسلے میں ۔

"مولانا کا کمال یہ ہے کہ ایک طرف تو اُس فطریت اور سادگی کا سر رشتہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے جو قرآن کے اسلوب بیان کی نمایاں خصوصیت ہے اور دوسری جانب جہاں کہیں قرآن کی کسی تاریخی حقیقت کو بیان کرنے کے لیے سائنٹیفک طریقہ استدلال کی ضرورت ہوتی ہے وہاں تحقیق و تدقیق اور بحث و نظر کا حق ادا کر دیتے ہیں۔"

چنانچہ قرآن میں ذوالقرنین نامی جس شخصیت کا ذکر آیا ہے اس کے بارے میں کافی اختلاف ہے کہ یہ کون شخص تھا؟ اکثر مفسرین کا رجحان یہ ہے کہ ذوالقرنین سے مراد سکندر مقدونی ہے۔ لیکن مولانا نے ان تمام آراء کے برخلاف بڑی تحقیق اور کاوش کے بعد آثار قدیمہ، اکتشافات جدیدہ اور پھر خود قرآن کے بیان کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ اس سے مراد ایران کا عظیم المرتبت بادشاہ کیخسرو ہے۔ مولانا نے اس بحث میں ایک بلند پایہ مؤرخ کا رول ادا کیا ہے اسی طرح۔

"خدا کی ذات و صفات پر سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں جو کلام کیا ہے وہ جس طرح انسانی فطرت و وجدان کو اپیل کرتا ہے فلسفہ کے طلباء اور علما کو بھی متاثر کرتا ہے۔ مولانا قرآن کی اصل فطریت اور سادگی اور اس کی وجدانیت کے ساتھ فلسفہ و سائنس کا پیوند اس خوش اسلوبی کے ساتھ لگاتے ہیں کہ وضعیت کا رنگ غالب نہیں ہونے پاتا اور وجدان کی بیداری کے ساتھ عقل کی تسکین کا بھی سامان ہوتا رہتا ہے۔"

ان چیزوں سے قطع نظر عام تفسیروں میں ایک نقص یہ ہے کہ ان میں معمولی معمولی اور فروعی باتوں پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک قرآن کی اہم اور بنیادی تعلیمات کا تعلق ہے جن کا رابطہ عام انسانی اجتماع و تمدن سے ہے ان پر یا تو کلام ہی نہیں کیا جاتا یا کلام کیا بھی تو محض سرسری اور ضمنی۔ جس سے قرآن کا بڑا مقصد فوت ہو جاتا ہے اور اس کا خطاب ایک قوم یا ایک جماعت کے ساتھ مختص ہو کر رہ جاتا ہے۔ مثلاً وحدت ادیان، اور دوسرے مذاہب اور ان کی الہامی کتابوں کی تصدیق۔ قرآن کی ایسی اہم اور بنیادی تعلیم ہے جس کو اس نے بار بار مختلف طریقوں سے بڑے شدومد کے ساتھ بیان کیا ہے۔ لیکن عام مفسرین نے اس پر زیادہ اعتنا نہیں کیا اور جہاں کہیں ایسی آیات آتی ہیں ان پر سرسری طور سے گزر گئے ہیں۔ متاخرین میں غالباً حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی پہلے شخص ہیں جنہوں نے حجۃ اللہ البالغہ میں اور دوسری کتابوں میں اس حقیقت کو زیادہ اُبھارا اور اُجاگر کیا ہے اور ان کے بعد مولانا ابو الکلام آزاد دوسرے بزرگ ہیں جنہوں نے اس بحث پر نہایت مدلل، واضح اور پُر زور کلام کیا ہے

اور اس سلسلے میں دین کی اصل حقیقت، عہد بعہد اس کا ارتقاء، شریعت و منہاج کا فرق، دین اور شریعت کا باہمی تعلق، دوسرے مذاہب، ان کے بانیوں اور ان کی آسمانی کتابوں کے متعلق قرآن کا نقطۂ نظر اور اس سلسلے میں پیغمبر اسلام کی عام دعوت اور انسانیت عامہ کی فلاح و بہبود کا اصل راز۔ ان تمام مباحث پر مولانا نے زورِ قلم، کمالِ بلاغت اور وسعتِ فکر و نظر کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس بحث کو پڑھ کر صاف محسوس ہوتا ہے کہ قرآن اس پروردگارِ عالم کا کلام ہے جس کی ربوبیت اور پروردگاری ہر انسان اور ہر شخص کے لیے ہے اور وہ کسی خاص ایک گروہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ قرآن فرقہ بندیوں اور گروہ سازیوں کو توڑنا چاہتا ہے نہ کہ ان میں اور اضافہ کرنا۔ وہ ایمان اور اعمالِ صالحہ کی طرف جو دعوت دیتا ہے وہ ایک ایسی ازلی اور ابدی حقیقت ہے جو ہر مذہب کی بنیاد ہے اس لیے اس کا کام وصل کردن ہے نہ کہ فصل کردن۔

چنانچہ مولانا اسلام کے لفظ کی تشریح بھی اسی وحدتِ ادیان کی روشنی میں اس طرح کرتے ہیں:

"اس نے (قرآن نے) دین کے لیے "الاسلام" کا لفظ اسی لیے اختیار کیا ہے کہ "اسلام" کے معنی کسی بات کے مان لینے اور فرماں برداری کرنے کے ہیں وہ کہتا ہے دین کی حقیقت یہی ہے کہ خدا نے جو قوانینِ سعادت انسان کے لیے ٹھہرا دیا ہے اس کی ٹھیک ٹھیک اطاعت کی جائے۔ وہ کہتا ہے۔ یہ کچھ انسان ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ تمام کائناتِ ہستی اسی اصل پر قائم ہے۔ سب کے بقاء و قیام کے لیے خدا نے کوئی قانونِ عمل ٹھہرا دیا ہے اور سب اسی کی اطاعت کر رہے ہیں۔ اگر ایک لمحہ کے لیے بھی روگردانی کریں تو کارخانہ ہستی درہم برہم ہو جائے ...... وہ جب کہتا ہے "الاسلام" کے سوا کوئی دین اللہ کے نزدیک مقبول نہیں تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ دینِ حقیقی کے سوا جو ایک ہی ہے اور تمام رسولوں کی مشترک تعلیم ہے انسانی ساخت کی کوئی گروہ بندی مقبول نہیں۔"

مولانا نے اس بحث کے آخر میں ایک بڑا نکتہ پیدا کیا ہے۔ مجھ کو یاد نہیں پڑتا کہ کہیں کسی اور جگہ میری نظر سے گزرا ہو۔ یہ سب کچھ لکھنے کے بعد خود سوال کرتے ہیں کہ :۔

"جب قرآن کی دعوت کا یہ حال تھا تو پھر آخر اس میں اور اس کے مخالفوں میں وجہِ نزاع کیا تھا؟ ایک شخص جو کسی کو برا نہیں کہتا سب کو مانتا اور سب کی تعظیم کرتا ہے اور ہمیشہ ان ہی باتوں کی تلقین کرتا ہے جو سب کے یہاں مانی ہوئی ہیں۔ کوئی اس سے لڑے تو کیوں لڑے؟ اور کیوں لوگوں کو اس کا ساتھ دینے سے انکار ہو؟"

اس سوال کو قائم کرنے کے بعد خود ہی اس کا جواب اس طرح دیتے ہیں :

"اصل یہ ہے کہ پیروانِ مذاہب کی مخالفت اس لیے نہ تھی کہ وہ (قرآن) انھیں جھٹلاتا کیوں ہے۔ بلکہ اس لیے تھی کہ جھٹلاتا کیوں نہیں؟ ہر مذہب کا پیرو چاہتا تھا کہ قرآن صرف اسی کو سچا کہے باقی سب کو جھٹلائے۔ اور چونکہ وہ یکساں طور پر سب کی تصدیق کرتا تھا اس لیے کوئی بھی اس سے خوش نہیں ہو سکتا تھا۔"

یہ جو کچھ عرض کیا گیا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مولانا نے تفسیر میں جو کچھ لکھا ہے اس کا ذہنی پس منظر کیا ہے؟ اب سوال یہ ہے کہ یہ ذہنی پس منظر خود بخود بن گیا یا اس کی تعمیر میں چند خارجی مؤثرات و عوامل کا دخل ہے؟ اصل یہ ہے کہ انیسویں صدی کا نصف آخر اور بیسویں صدی کا شروع ایک ایسا دور ہے جس میں عالمِ اسلام نے فکری اور ذہنی طور پر ایک نئی کروٹ لی ہے۔ اس کے اسباب سیاسی بھی ہیں اور علمی بھی۔ دنیا کے عام تمدنی حالات بھی ہیں اور علومِ جدیدہ کا ارتقاء بھی! اسی نئی کروٹ کا نتیجہ تھا کہ مصر میں مفتی عبدہٗ اور سید رشید رضا پیدا ہوئے اور ہندوستان میں شبلی اور سر سید۔ مولانا ابو الکلام کی سوانح عمری سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف تو مولانا میں خود اجتہادِ فکر کی کمی نہیں تھی اور دوسری جانب وہ سید رشید رضا اور سر سید احمد خاں دونوں کی تحریروں سے کافی متاثر تھے اور ان کا بکثرت مطالعہ کرتے تھے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص سید رشید رضا کی تفسیر المنار اور

مولانا کا ترجمان القرآن ایک ساتھ مطالعہ کرے تو اسے صاف نظر آئے گا کہ ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے دو ذہن ہیں جو دو مختلف زمانوں میں اظہار مطلب کر رہے ہیں۔

متوسطین میں مولانا حافظ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم سے کافی متاثر ہیں۔ الہلال اور البلاغ، کے زمانے میں مولانا کے قلم سے جو مذہبی تحریریں نکلیں ان میں یہ رنگ کافی نمایاں نظر آتا ہے۔ لیکن مولانا کے زور بیان و انشا اور قدرت و بلاغت کلام کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے خواہ کوئی فکر یا خیال کہیں سے لیا ہو لیکن اس کو اس بسط و تفصیل سے اور مدلل و مبرہن بیان کریں گے کہ اس فکر کے بانی اور موجد ہی نظر آئیں گے۔

شروع شروع میں جب مولانا کی کتاب "ترجمان القرآن" چھپ کر آئی تو جیسا کہ پہلے سے توقع تھی جہاں عام طور پر اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور سراہا گیا مسلمانوں کے ایک طبقے میں اس پر سخت تنقید اور نکتہ چینی بھی ہوئی۔ جو لوگ چار پانچ صدیوں سے اجتہاد فکر سے محروم ہو کر تقلید محض اور جمود ذہنی کی زندگی بسر کر رہے ہوں ان میں مولانا ابو الکلام آزاد لیسے مجتہد فکر کا پیدا ہو جانا ان کے ہیجان کا باعث ہی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ترجمان القرآن پر تنقیدیں ہوئیں اور بہت دنوں تک اخبارات اور رسائل میں یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اگر ان تمام تنقیدوں کا تجزیہ کیا جائے تو ان تنقیدوں کا ماحصل صرف یہ دو چیزیں ملیں گی۔

۱۔ مولانا نے قرآنی حقائق کا بیان اور آیات کی تفاسیر میں بالکل قرآنی اسلوب کی پیروی کی ہے یعنی جہاں قرآن میں کوئی حقیقت مطلق ہے مولانا نے بھی اس کو اسی طرح بیان کیا ہے اور جو حقیقت مقید بیان کی گئی ہے مولانا نے بھی اس کی رعایت رکھی ہے اس اسلوب سے ان لوگوں کی تشفی تو ہو جاتی ہے جو قرآن کو فقہ و کلام کی فرقہ بندیوں سے بلند و بالا ہو کر پڑھتے ہیں لیکن جن دماغوں پر فقہی مکاتب خیال کا اس قدر غلبہ ہے کہ وہ ان سے الگ ہو کر کسی بات کو سوچ ہی نہیں سکتے ان کو یقیناً مولانا کے اسلوب و زاویۂ نظر سے اختلاف ہونا چاہیے۔

۲۔ دوسرا اعتراض یہ تھا کہ مولانا نے تفسیر بالرائے سے کام لیا ہے جس کی حدیث

میں مذمت آئی ہے لیکن یہ اعتراض بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ جہاں تک مولانا کی تفسیر کے مآخذ کا سوال ہے ان کی نسبت مولانا نے خود لکھ دیا ہے کہ :

"پہلے اس کی تفسیر صحابہ و تابعین کی روایات میں ڈھونڈو۔ پھر بعد کے مفسرین کی طرف رخ کرو اور دونوں کا مقابلہ کرو۔ صاف نظر آئے گا کہ صحابہ و سلف کی تفسیر میں معاملہ بالکل واضح تھا۔ بعد کی دقیقہ سنجیوں نے اسے کچھ سے کچھ بنا دیا اور الجھاؤ پیدا ہو گئے۔"

اس عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے جو کچھ لکھا ہے اس کی اصل صحابہ و سلف کے ہاں ضرور موجود ہے اور محض ایجاد بندہ نہیں ہے۔ جہاں تک تفسیر بالرائے کا تعلق ہے خود مولانا اس کے متعلق لکھتے ہیں :

"اشکال و موانع کا بڑا دروازہ تفسیر بالرائے سے کھل گیا جس کے اندیشے سے صحابہ و سلف کی روحیں لرزتی رہتی تھیں۔"

لیکن تفسیر بالرائے سے مولانا کی مراد کیا ہے؟ اس کو بھی مولانا کی زبان سے سن لیجیے تاکہ مولانا کا نقطۂ نظر سمجھنے میں کوئی کھٹک باقی نہ رہے۔ فرماتے ہیں :

"تفسیر بالرائے کا مطلب سمجھنے میں لوگوں کو لغزشیں ہوئی ہیں۔ تفسیر بالرائے کی ممانعت سے مقصود یہ نہ تھا کہ قرآن کے مطالب میں عقل و بصیرت سے کام نہ لیا جائے۔ کیونکہ اگر یہ مطلب ہو تو پھر قرآن کا درس و مطالعہ ہی بے سود ہو جائے۔ حالانکہ خود قرآن کا حال یہ ہے کہ اول سے آخر تک تعقل و تفکر کی دعوت ہے۔ اور ہر جگہ مطالبہ کرتا ہے کہ افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالها

دراصل تفسیر بالرائے میں رائے لغوی معنی میں نہیں ہے بلکہ رائے مصطلحہ شارع ہے اور اس سے مقصود ایسی تفسیر ہے جو اس لیے نہ کی جائے کہ خود قرآن کیا کہتا ہے بلکہ اس لیے کی جائے کہ ہماری کوئی ٹھہرائی ہوئی رائے کیا چاہتی ہے اور کس طرح قرآن کو کھینچ تان کر اس کے مطابق کر دیا جا سکتا ہے۔"

اس بنا پر مولانا کو متداول اور مروجہ تفسیروں سے جو شکایت ہے وہ یہ ہے کہ:

"جس مقام کی تفسیر میں متعدد اقوال موجود ہوں گے وہاں اکثر اسی قول کو ترجیح دیں گے جو سب سے زیادہ کمزور اور بے محل ہوگا۔ جو اقوال نقل کریں گے ان میں بہتر قول موجود ہوگا لیکن اس کو نظر انداز کر دیں گے۔"

مولانا کی مندرجہ بالا عبارتوں سے صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ ان میں اور دوسرے مفسرین میں جو راہوں کا اختلاف ہے اس کا مبنیٰ کیا ہے؟ اس بنا پر اگر بعض حلقوں میں مولانا کی تفسیر پر نکتہ چینی ہوئی تو وہ ہرگز خلافِ توقع اور محلِ تعجب نہیں ہے۔

ترجمان القرآن، قرآن مجید کی تفسیر بھی ہے اور ترجمہ بھی۔ اب تک آپ نے جو کچھ پڑھا وہ تفسیر سے متعلق تھا۔ اب چند باتیں ترجمہ کی نسبت سُن لیجیے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک زبان سے کسی دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ اصل زبان سے واقف نہیں ہیں وہ ترجمہ کے ذریعہ اس عبارت کا مفہوم و مطلب سمجھ جائیں مگر عام طور پر قرآن کے جو تراجم اردو میں پائے جاتے ہیں ان سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ تراجم لفظی بلکہ تحت اللفظی ہیں اور اُن سے مقصد اخذ کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ اس قسم کے تراجم کے برخلاف مولوی نذیر احمدؒ دہلوی نے ترجمۂ قرآن میں دلی کی بولی ٹھولی کو اس درجہ دخل دیا کہ بعض مقامات پر قرآن کی سنجیدگی اور ثقاہت مجروح ہوگئی۔ لیکن مولانا نے نہ وہ راہ اختیار کی اور نہ یہ، بلکہ ایک طرف تو قرآن کی عظمت اور ثقاہت کا پورا خیال رکھتے ہیں اور ایسا کوئی لفظ نہیں آنے دیتے جو قرآن کے مرتبۂ ثقاہت سے فروتر ہو اور دوسری جانب ترجمہ کی ترتیب اس طرح قائم کی ہے کہ وہ اپنی وضاحت میں کسی کا محتاج نہیں۔ ایک عالم کی طرح ایک عام اردو خواں بھی اس سے پوری طرح استفادہ کر سکتا ہے۔ پھر مولانا نے صرف ترجمہ پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ جابجا نوٹوں کا بھی اضافہ ہے جن میں مطالبِ قرآن کی تفسیر و توضیح کی گئی ہے۔ قرآن میں جو مطلب یا جو حکم مجمل تھا اس کی تفصیل کھول دی ہے تاکہ قرآن کا اصل مطلب سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہو اور جہاں جہاں قرآن کے کسی مطلب کو واضح کرنے کے لیے دلائل و شواہد کی ضرورت تھی وہاں دلائل و شواہد ہیں۔ اس طرح یہ ترجمہ بجائے خود مستقل افادیت کا حامل ہے۔ اگر کوئی

شخص تفسیر کا مطالعہ نہ بھی کرے تو نفس ترجمہ اور اس پر جو نوٹس ہیں ان کی مدد سے قرآن کے مطالب کو سمجھ سکتا ہے۔

پھر ترجمہ اور تفسیر اور یہی نہیں بلکہ مولانا کے عام مذہبی مضامین کی ایک نمایاں خصوصیت جس پر شاید عام لوگوں کی نظر نہیں ، یہ ہے کہ ان سب میں مولانا کا اسلوبِ بیان وہی ہے جو قرآن کا ہے یعنی حکیمانہ ہونے کے ساتھ ساتھ خطیبانہ بھی ہے اس میں وعد بھی ہے اور وعید بھی تبشیر بھی ہے اور انذار بھی۔ کہیں وہ نسیم جاں فزا ہے اور کہیں برق صاعقہ فگن۔ اس لیے قدرتی طور پر اس کا اثر ہوتا ہے اور قاری میں ہیجانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے مولانا کا یہ طرز ادا یہ اسلوب بیان اُن کے ہر مذہبی مضمون میں نمایاں ہے لیکن جہاں تک ترجمان القرآن کا تعلق ہے تو یہ شراب دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ ہو گئی ہے اور اس لیے غالب کا یہ شعر اس پر پوری طرح صادق آتا ہے ؎

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیان اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو راز داں اپنا

مولانا ابوالکلام کی مذہبی زندگی

مولانا ابوالکلام آزادؒ کے انتقال کے بعد حکومتِ ہند کے سرکاری ماہنامہ "آجکل" (نئی دہلی) کا آزاد نمبر شائع ہوا تھا جس کے بارے میں صدق جدید" (جلد ۹ نمبر ۴۶) مؤرخہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۹ء میں صفحہ ۸ پر ایک مراسلہ شائع ہوا تھا جس میں یہ شکایت کی گئی تھی کہ "... کسی مضمون سے اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ اتنا بڑا علامۃ الدہر صبح و شام کی پانچ نمازوں میں سے کتنے وقت نماز پڑھتا تھا اور کیا اہتمام کرتا تھا۔ ... یہ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ اتنا بڑا عالم سرے سے نماز روزہ رکھتا اور پڑھتا ہی نہ ہو اور اس کے صبح کے اوقات تلاوتِ قرآن سے بکسر عاری ہوں۔ اگر ایسا نہیں ہے اور خدا نہ کرے کہ ایسا ہو، جہاں موصوف کی زندگی کے معمولی سے معمولی واقعہ کو لکھا گیا ہے، ان مذہبی معاملات کو نظرانداز کرنا، قوتِ انصاف نظر نہیں آتا" اس مراسلے کے اختتام پر "صدق" کی طرف سے حسب ذیل نوٹ درج کیا گیا:

> "مزید حیرت اس لیے کہ اس آزاد نمبر میں لکھنے والے بعض مذہبی لوگ بھی ہیں ——— مثلاً مولانا سعید احمد اکبرآبادی یا مہر صاحب لاہور۔ کاش کوئی صاحب خصوصاً جمیعۃ العلماء سے تعلق رکھنے والے اپنی ذمہ داری پر اس خلا کو پر کریں"

مولانا دریابادی کا یہ نوٹ مولانا اکبرآبادی کے اس مراسلہ کا باعث ہوا تھا (عبداللطیف اعظمی)

"سیرت النبیؐ قرآن مجید کی روشنی میں" بڑا عمدہ مقالہ نکل رہا ہے، اللہ کی شان ہے، رواروی اور جلدی میں بھی اس قدر مفید اور جامع مقالہ آپ کے قلم سے نکل گیا۔ ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء!

"صدق" مورخہ ۱۶ اکتوبر (۱۹۵۹ء) ملا، اس کے صفحہ ۸ پر "آزاد نمبر میں ایک فروگذاشت" کے عنوان سے جو مراسلہ چھپا ہے، اس پر آپ نے جو نوٹ لکھا ہے، چونکہ

اس میں اس خاکسار کا بھی نام ہے، اس لیے عرض یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی پرائیویٹ زندگی حد درجہ پُراسرار تھی، وہ ملاقات کے لیے ڈرائینگ روم میں آجاتے تھے، ورنہ اپنے کمرے میں بند رہتے تھے، جہاں بڑے سے بڑا ان کا دوست بھی نہیں جا سکتا تھا۔ بعض معتبر راویوں[1] سے معلوم ہوا ہے کہ مولانا اپنے کمرے میں زیادہ تر وقت مطالعہ میں صرف کرتے تھے۔ قرآنِ مجید سے ان کو بڑا شغف تھا، وقت بے وقت اس کو اٹھا لیا اور جھوم جھوم کر پڑھنا شروع کر دیا۔ بسا اوقات ایک ہی آیت کو بار بار پڑھتے اور ہر مرتبہ آواز کے ساتھ ان کی وضعِ نشست بدل جاتی تھی۔ مولانا اپنے اور ذاتی معاملات میں جو اخفا رسے کام لیتے تھے، وہ تو لیتے ہی تھے، عبادت کے معاملے میں خصوصاً بہت زیادہ اخفاء کرتے تھے۔ اور ان کی اس طبیعت کی وجہ سے کسی کو اس بارے میں خود ان سے کچھ دریافت کرنے کی ہمت نہیں ہو سکتی تھی۔ بہرحال ۱۹۲۶ء میں جب پہلی مرتبہ میں چند روز کے لیے کلکتہ گیا تھا تو ان دنوں میں مولانا مفتی عتیق الرحمان صاحب عثمانی کی معیت میں دو تین بار مولانا کی خدمت میں بھی حاضری کا موقع ملا تھا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ بات چیت کرتے کرتے اگر مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا ہے تو مولانا نے نوکر کو آواز دی۔ اس نے جانماز بچھا دی اور مولانا جس حالت میں بیٹھے تھے، اسی حالت میں کھڑے ہو کر نماز میں شریک ہو گئے، یعنی وضو نہیں کرتے تھے، یہ گویا اس کی علامت تھی کہ عصر کی نماز پڑھے ہوئے ہیں اور باوضو ہیں۔ ان نمازوں میں وہ ہمیشہ مولانا مفتی عتیق الرحمان صاحب کو امام بناتے تھے۔ کیونکہ مولانا، مفتی صاحب موصوف کے حسنِ قرأت وصوت کے بڑے مداح تھے اور ان کی صحتِ مخارج کی بڑی تعریف کرتے تھے۔ فرض نماز کے بعد میں نے دیکھا ہے، دو رکعت سنت کمال خشوع و خضوع سے پڑھتے اور تقریباً دس بارہ منٹ میں انہیں ختم کرتے تھے، اس کے بعد صوفے پر آنکھ بند کر کے بیٹھ جاتے تھے جیسے کوئی مراقبہ کر رہا ہو، دس پندرہ منٹ بعد آنکھ کھولتے اور پھر گفتگو شروع کر دیتے

---

[1] یہ معتبر راوی جمعیۃ علمائے ہند سے تعلق رکھنے والوں کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

(مرتب)

تھے۔ مگر یہ گفتگو ہلکی اور مدھم آواز میں ہوتی تھی۔

مولانا اگر سفر میں ہوتے یا کسی میٹنگ میں شریک ہوتے تھے، تو ایسے موقع پر "جمع بین الصلوٰتین" کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اس پر گفتگو ہوئی تو فرمایا: "امام بخاریؒ تو بلا کسی وجہ کے بھی "جمع بین الصلوٰتین" کو جائز قرار دیتے ہیں، میں تو صرف عند الضرورت ہی اس پر عمل کرتا ہوں۔

اس سلسلہ میں یہ واقعہ بھی آپ کی دلچسپی کا سبب ہوگا کہ پانچ چھ برس کی بات ہے، ایک دن شام کو مولانا نے ایک مشہور منکرِ خدا شاعرؔ، جو مولانا کے یہاں آمد و رفت رکھتا تھا، اس سے فرمایا کہ ۔ ۔ ۔ صاحب! میں چاہتا ہوں کہ خدا کے وجود پر ایک مرتبہ میں کھل کر آپ سے بات چیت کر لوں، پھر چاہے آپ مانیں یا نہ مانیں، مگر میں اپنا فرض ادا کر دونگا، چنانچہ دوسرے دن صبح کے نو بجے کا وقت مقرر ہوا، یہ شاعر اپنے دو تین دوستوں کے ساتھ مولانا کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔ جمعیۃ علماء کے بعض حضرات کو اس کا علم ہوا تو وہ بھی پہنچ گئے۔ یہ رمضان کا مہینہ تھا اور سخت گرمی پڑ رہی تھی، مولانا روزے سے تھے مگر بایں ہمہ قاضی سجاد حسین صاحب صدر مدرس مدرسہ عالیہ فتحپوری، دہلی، جو خود اس مجلس میں شریک تھے، ان کا بیان ہے کہ مولانا نے دو گھنٹے تک وجودِ باری پر اس قدر فاضلانہ تقریر کی کہ سب لوگ دم بخود تھے۔ دلائل سب کے سب عقلی اور فلسفیانہ تھے اور روانی اور فصاحت و بلاغت کا تو کہنا ہی کیا ہے، قاضی صاحب موصوف جو خود جیّد عالم ہیں، فرماتے تھے کہ مولانا کے تبحرِ علمی کا صحیح اندازہ اس وقت ہوا اور پتہ چلا کہ ان کا مستحضر علم بھی کس قدر عمیق ہے۔

صدق:

مکتوب گرامی کا آخری جز ذرا بھی مستبعد نہیں اور بہت آسانی سے قابلِ یقین ہے۔

---

[1] اشارہ صاف جوش ملیح آبادی کی طرف ہے (مرتب)

مرحوم مولانا کی خوش تقریری میں کسے شبہہ ہو سکتا ہے، یہ دوسرے مسئلے کی طرح وہ وجود باری پر بھی یقیناً بہت اچھی تقریر کرتے تھے، اور ضرور انہوں نے کی ہوگی، باقی ذاتی عملی زندگی سے متعلق جو روشنی اس مکتوب میں ڈالی گئی ہے، وہ بیشک بہتوں کو نئی معلوم ہوگی ایک مسلمان پر سے جو بھی الزام دفع ہو سکیں یا ہلکے ہو سکیں، اس سے بڑھ کر خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟[1]

(صدق جدید لکھنؤ، ۱۱ر دسمبر ۱۹۵۹ء صفحہ ۵)

---

[1] مولانا دریابادی (مدیر صدق جدید) کا یہ نوٹ اس دور کا ہے جب مولانا آزادؒ سے رنجش دل میں کسی قدر باقی تھی۔ بعد میں مولاناؒ سے متعلق اپنے رویے کی معذرت اور خدا کے حضور عفو خواہی سے تو انہوں نے اسلامی سیرت کی جو مثال قائم کی، اس نے خود ہی ان کی عظمت کا فیصلہ کر دیا (مرتب)

افادات حضرت شیخ الہندؒ

اصل بات یہ ہے کہ علماء کے ہمیشہ دو طبقے رہے ہیں۔ ایک وہ جو درس و افتاء کی چہار دیواری اور ظواہر احکام کے حصار میں مقید و محدود رہے اور عوامی زندگی سے کبھی کوئی واسطہ نہ رکھا اور ملکی و قومی مسائل کو سیاست کا نام دے کر ان سے مجتنب اور دامن کشاں رہے۔ ان کے برخلاف ایک دوسرا طبقہ تھا جو علم و فضل اور تقویٰ و طہارت کے اعلیٰ اوصاف سے مزین ہونے کے ساتھ ملکی و قومی مسائل و معاملات اور عوام کی زندگی سے دلچسپی لینے کو اپنا دینی وظیفہ سمجھتا تھا۔ ظاہر ہے، ایک انسان سب سے الگ تھلگ گوشۂ تنہائی میں زندگی بسر کرتا ہے تو معاشرتی مسائل کے بارے میں اس کا نقطۂ نظر تنگ اور کوتاہ بینی کا صید زبوں ہوتا ہے۔ لیکن جو شخص سوشل لائف کا عادی ہے، اس کے نقطۂ نظر میں توسع ہوتا ہے جسے عام اصطلاح میں روشن خیالی کہتے ہیں۔ یہی وہ فرق و امتیاز ہے جو معاشرتی مسائل کے متعلق علماء کے مذکورہ بالا دو طبقوں کے طریقِ فکر و نقطۂ نظر میں پایا جاتا ہے۔ . . . .

حضرت شیخ الہند نے مکتبۂ فکر ولی اللّٰہی کے حقیقی اور اعلیٰ ترجمان کی حیثیت سے ملک کی سیاست سے دلچسپی لینی شروع کی اور استخلاص وطن کی غرض سے ایک عظیم انقلابی تحریک کی تاسیس کی، تو ظاہر ہے ایسی کوئی تحریک برادرانِ وطن کے اشتراک و تعاون کے بغیر پروان نہیں چڑھ سکتی تھی۔ چنانچہ آپ نے یہ تعاون حاصل کیا اور اس میں اپنی وسعتِ قلب کا اظہار یہاں تک فرمایا کہ کابل میں جو عارضی حکومت اس تحریک کے ماتحت بنی، اس کا صدر راجہ مہندر پرتاپ کو بنایا گیا۔ اربابِ مدرسہ و خانقاہ کی فطرت و جبلّت کے برخلاف ایک عظیم انقلابی رہنما ہونے کے باعث حضرت شیخ الہند کے فکر و نظر میں کتنا توسع پیدا ہو گیا تھا، اس کا اندازہ

اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جب ایک مرتبہ کسی نے کہا "حضرت آپ "الہلال" اس ذوق شوق سے پڑھتے ہیں، حالانکہ اس میں تصاویر ہوتی ہیں اور اس کا ایڈیٹر (مولانا ابوالکلام آزاد) متشرع بھی نہیں ہے" تو حضرت شیخ الہند نے فوراً شعر پڑھا ؎

کامل اس فرقۂ زہاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

اور پھر فرمایا:

"میں "الہلال" کیوں نہ پڑھوں کہ یہ پہلا رسالہ ہے جس نے ہم کو جہاد کا سبق یاد دلایا ہے جو ہمارا فریضہ تھا اور ہم اسے بھول چکے تھے"

ایک مرتبہ اسی قسم کا تذکرہ تھا کہ حضرت شیخ نے ذوق کا یہ شعر کسی قدر تصرف کے ساتھ پڑھا ؎

ذوق جو مدرسوں کے بگڑے ہوئے ہیں مُلّا
مالٹا میں انہیں لے آؤ، سنور جائیں گے!

(ماہنامہ "برہان" دہلی، جون ۱۹۸۰ء، ص ۴، ۵)

۵۸

"ترکشِ مارا خدنگِ آخریں"

وا حسرتا! ابھی حضرت شیخ[1] رحمۃ اللہ علیہ کی جدائی کا غم تازہ ہی تھا اور امتدادِ روزگار کا مرہم اس غم کی جراحت سامانیوں کو کم نہیں کر سکا تھا کہ اچانک مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات حسرت آیات کا سانحۂ جاں گداز پیش آ گیا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے　　ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

عام پیرایۂ بیان میں لوگ کہتے ہیں کہ مولانا علومِ جدیدہ کے مُبصّرِ عالم تھے، سحر طراز انشا پرداز، بلند پایہ ادیب۔ جادو فشاں خطیب تھے۔ فہم و تدبر، ذہانت و فطانت اُن کے اوصاف و کمالاتِ طبعی کا تکمۂ زریں تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سب عنوانات مولانا کی اصل شخصیت کی ترجمانی اور عکاسی سے قاصر ہیں وہ بذاتِ خود ایک تاریخ تھے اور تاریخ ساز بھی، وہ مستقل ایک عہد تھے اور عہد آفریں بھی۔ انھوں نے اپنے دماغ اور زبان و قلم سے ایک عہد پیدا کیا جس کی ہمہ گیری اور وسعت کا یہ عالم تھا کہ اُس سے مذہب بھی متاثر ہوا اور ادب بھی۔ سیاست بھی اُس سے اثر پذیر ہوئی اور تہذیب و ثقافت بھی۔ اُن کا قلم ابرِ بہاراں بھی تھا اور برقِ شرر فشاں بھی۔ علم و حکمت اور شعر و ادب کے میدان کی طرف نکل گیا تو فروغِ نظر اور ایمان و یقین کے لالہ و گل کو پیغامِ نشو و نما دیتا گیا، اور چٹیل میدانوں کو گل و گلزار بنا گیا۔ اور اگر اُس نے مذہب اور سیاست کی طرف رُخ کیا تو فکر و نظر اور احساس و شعور کی دنیا میں

---

[1] شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ (ف ۵ دسمبر ۱۹۵۷ء)

طوفان برپا کر گیا، جو گوشہ نشین تھے وہ اس آواز کو سن کر گھروں سے نکل پڑے، جن پر غلامی کی غفلت و مدہوشی کا تسلّط تھا وہ جوش و ولولۂ عمل سے سرشار ہو کر زندگی کا ایک نیا خون اپنی رگوں میں دوڑتا ہوا محسوس کرنے لگے۔ وہ ہر بزم اور ہر محفل میں پہنچا اور ہر جگہ صدرِ انجمن اور میر محفل ہو کر رہا، مذہب، سیاست اور ادب، تہذیب اور معاشرت ان میں کوئی منزل ایسی نہیں ہے جس کی طرف اُس نے رخ نہ کیا ہو، اور اُس میں اپنے اجتہاد و تحقیق، سنجیدہ فکر اور نظر بلند کے لازوال نقوش نہ چھوڑ گیا ہو۔

ایک شخص آج کل کے رسمی طریقۂ تعلیم سے نا آشنا ہونے کے باوجود محض اپنی خداداد غیر معمولی ذہانت و فطانت اور ذاتی مطالعۂ و تحقیق سے کس قدر اونچا ہو سکتا ہے، مولانا اُس کی برہانِ مبین اور دلیلِ روشن تھے اور اس طرح کی عبقریت کی مثالیں دنیا میں کم ہی ملیں گی۔ چنانچہ جس طفلِ نوخیز نے بارہ، تیرہ برس کی عمر میں اُردو کی اخبار نویسی سے اپنی زندگی شروع کی تھی وہ نوجوانی میں ہی اس قدر بلند اور سرفراز ہو گیا کہ جس محفل میں سن رسیدہ ملک کے اکابر و زعماء یک جا بیٹھتے تھے وہاں بھی وہ کرسیِ صدارت پر متمکن نظر آتا تھا، اکابر علماء نے اُس کو "امام الہند" کہا۔ ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کانگرس نے تحریک آزادی کے سب سے زیادہ نازک دور میں اُسی کی قیادت میں جدوجہد کی آخری منزلیں طے کیں اور پھر آزاد ملک میں سب سے پہلا مرکزی وزیرِ تعلیم بھی وہی بنا۔ یہ ایک محکمہ تو محض رسمی طور پر تھا ورنہ اُس کا ناخنِ تدبر و فہم ملک کی تمام سیاسی گتھیوں ہی کے سلجھانے میں مصروف رہا۔ چنانچہ آج یہ شخصیت ہم میں موجود نہیں ہے تو ہر طبقہ اور ہر گروہ میں اُس کا ماتم بپا ہے، علماء رو رہے ہیں کہ اُن کا سرتاج اُٹھ گیا، علوم و فنون کے ماہر اشک فشاں ہیں کہ ایک عظیم الشان اسکالر جاتا رہا۔ وزیر اعظم نہرو ماتم کناں ہیں کہ اب مشورہ اور رائے کس سے لیں گے۔ وزیر داخلہ پنڈت پنت کو ملال ہے کہ مولانا کی وفات ملک کے لیے مہاتما گاندھی کے بعد سب سے بڑا حادثہ ہے۔ غور کرنا چاہیے کہ کسی ایک شخصیت کے جامع اور ہمہ گیر ہونے کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گی کہ ہر شخص بلا تفریق مذہب و ملت اپنے

خاص نقطۂ نظر اور مذاقِ طبع کے ماتحت اُس کو مجموعۂ کمالات و اوصاف سمجھے اور اُس کی وفات پر اشک فشاں و گریہ کُناں ہو۔

اگرچہ ملک کی آزادی کے بعد سے مولانا گوشہ نشین ہو گئے تھے، اور عوام سے ربط باقی نہیں رکھا تھا لیکن اُس کی وجہ اُس کے سوا کچھ اور نہیں تھی کہ مولانا اس بات کا یقین رکھتے تھے کہ ملک کے خاص حالات میں اُن کا پبلک میں آنا اور تقریریں کرنا کوئی مفید نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا بلکہ اُس سے تھوڑے بہت نقصان ہی کا خطرہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے ملک کی خدمت کا صحیح اور درست طریقہ یہی ہے کہ خاموشی کے ساتھ ملک کی تعمیری خدمات انجام دی جائیں، اور اس سلسلہ میں پنڈت نہرو کو زیادہ سے زیادہ قوت بہم پہنچائی جائے، اور اپنے صحیح مشوروں سے اُن کی مدد کی جائے۔ چنانچہ اسی سیاست پر وہ آخر وقت تک عمل پیرا رہے۔ جو کچھ ان کو کہنا ہوتا تھا وہ پنڈت نہرو سے کہلاتے تھے، اور جو کچھ انھیں کرنا ہوتا تھا پنڈت جی سے کراتے تھے۔

مولانا کے کیرکٹر کی یہ بھی بڑی اہم خصوصیت تھی کہ اُن کو اپنی زبان اور دل و دماغ پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ خود اُن کے بقول انھوں نے سالہا سال کی مشق کے بعد اپنے اندر یہ کمال پیدا کر لیا تھا کہ کسی کی مدح و ذم کا اُن پر مطلق کوئی اثر نہ ہوتا تھا اور ہمیشہ اپنی صوابدید کے مطابق کام کرتے تھے۔ جب بولنے کی ضرورت ہوتی تھی تو بھرپور تقریر کرتے تھے اور جب بولنے کو مضر جانتے تھے تو بالکل چپ سادھ لیتے تھے۔

مولانا کے سیاسی مخالفین نے برا بھلا کہنے میں کون سی کسر اُٹھا رکھی تھی لیکن سب جانتے ہیں کہ مولانا کی پیشانی پر غیظ و غضب کی ایک شکن بھی نہیں پڑی۔ اور کبھی خلوت میں بھی کسی بڑے سے بڑے مخالف کا ذکر بدی کے ساتھ نہیں کیا اور صرف یہی نہیں بلکہ اپنی موجودگی میں کسی کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی، شرافتِ نفس کا یہ عالم تھا کہ زبان کبھی فحش اور گندے لفظ سے آشنا نہیں ہوئی۔

غیور و خود دار بھی اس پایہ کے تھے کہ والدِ مرحوم کی استخواں فروشی ہرگز گوارا نہیں

کی حالانکہ اس ذریعے سے بلا کسی محنت و مشقت کے لاکھوں کما سکتے اور ایک وسیع و متمول طبقے کے مرشدِ روحانی بن سکتے تھے۔ مولانا پر سخت قسم کی عسرت و تنگ دستی کے دور بھی آئے۔ لیکن کیا مجال کہ زبان کسی کے سامنے اظہارِ احتیاج کے ننگ سے آلودہ ہوئی ہو، یہ وہ اخلاقی اوصاف ہیں جو اس زمانے میں علماء اور مشائخ اور عبّاد و صلحا تک میں عموماً ناپید ہیں پھر اور لوگوں کا تو کہنا ہی کیا ہے۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے مولانا اکابر و زعمائے امت کی پرانی نسل کی آخری یادگار تھے، اس لیے مولانا کی وفات ایک شخص اور ایک بڑے آدمی کی موت نہیں۔ بلکہ پورے ایک عہد، ایک دور، ایک قرن کی موت ہے۔ مسلمانانِ ہند کی تاریخ عہد حاضر کا ایک باب ختم ہو گیا۔ بس سدا رہے نام اللہ کا "کل شیٔ ھالک الا وجھہ" اس دنیا کی ریت یہی ہے۔ جو آیا ہے اس کو جانا ضرور ہے۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔"

(برہان، دہلی۔ مارچ ۱۹۵۸ء)

تصنیفاتِ آزاد اور ساہتیہ اکادمی

خوشی کی بات ہے کہ حکومتِ ہند کے ادبی ادارہ ساہتیہ اکادمی نے مولانا ابوالکلام آزاد کی تمام تحریروں۔ کتابوں اور خطوں کو چھاپنے کا ایک پروگرام بنایا ہے، اور اس مقصد کے لیے ایک کمیٹی بنادی ہے جس کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین ہیں، ڈاکٹر صاحب کے علاوہ اور جو حضرات اس کمیٹی کے ممبر ہیں وہ بھی اردو زبان کے جانے پہچانے اہلِ قلم اور ادیب ہیں لیکن چونکہ مولانا ابوالکلام خواہ اور جو کچھ بھی ہوں اصلاً ایک عالمِ دین ہی تھے۔ اسی حیثیت سے انھوں نے پبلک لائف شروع کی، اور اسی حیثیت کے سایے میں وہ بعد میں سب کچھ بنے۔ اس بناء پر مولانا کا سرمایۂ تحریر زیادہ تر مذہبی مضامین پر ہی مشتمل ہے۔ پھر چوں کہ مولانا نے مختلف وجوہ و اسباب سے یہ مضامین زیادہ تر اپنے حافظے پر اعتماد کر کے لکھے ہیں، اس لیے ان میں حوالے یا تعبیر کی بعض غلطیاں بھی ہوگئی ہیں چنانچہ کتاب ترجمان القرآن جو مولانا کی تصانیف میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے وہ بھی غلطیوں سے خالی نہیں اور بعض غلطیاں تو علمی اعتبار سے بڑی فاحش ہیں مثلاً سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں "مالک یوم الدین" کے ماتحت مولانا نے عربی کا یہ شعر نقل کیا ہے۔

ستعلم لیلیٰ ای دین تداینت　　　　و ای غریم فی التقاضی غریمہا

اس شعر میں مولانا نے "دین" کے لفظ کو بکسر الدال پڑھا ہے حالانکہ صحیح بفتح الدال ہے اور "قرض" کے معنی میں ہے چنانچہ "تداینت" "غریم" اور "تقاضی" ان سب لفظوں سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، اس بناء پر یہ نہایت ضروری ہے کہ جہاں کہیں اس طرح کی غلطی ہو اُس کی تصحیح کر دی جائے یا کم از کم فٹ نوٹ میں اُس کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے ضروری تھا کہ کمیٹی میں مولانا حفظ الرحمٰن

یا مولانا عتیق الرحمٰن جیسے ایک دو عالموں کو بھی شامل کیا جاتا۔ تاکہ مولانا کے مذہبی مضامین کی ترتیب و تہذیب اور ان کا اڈیٹنگ خاطر خواہ طریقے پر ہوتا۔ غالباً کمیٹی کو اس بات کا اختیار ہے کہ وہ تعاون کے لیے اگر ضرورت سمجھے تو دو ایک ناموں کا ممبروں میں اضافہ کر سکتی ہے اگر واقعی ایسا ہے تو ہم کو امید ہے کہ کمیٹی ہماری مخلصانہ گزارش پر توجہ کرے گی۔

(برہان، دہلی۔ جون ۱۹۵۸ء)

مولوی عبدالحق اور مولانا آزاد

دنیا جانتی ہے مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی میں لوگوں نے انھیں کیا کچھ نہیں کہا۔ ان پر کیسے کیسے طوفان جوڑے گئے، کیسی کیسی تہمتیں لگائی گئیں، اور کس کس طرح کی نازیبا باتیں اُن کی نسبت مشہور کی گئیں۔ لیکن مولانا علم و فضل کے اعتبار سے جتنے بڑے انسان تھے۔ وسعتِ ظرف، عالی حوصلگی اور شرافتِ نفس کے لحاظ سے بھی بہت اونچا مقام رکھتے تھے، اس لیے انھوں نے خلوت اور پرائیویٹ مجلسوں میں بھی کبھی اپنے بڑے سے بڑے مخالف کا تذکرہ بُرائی کے ساتھ نہیں کیا، اور اگر کسی نے ایسا کوئی ذکر چھیڑا بھی تو ہنس کر یا کوئی بلیغ فقرہ کہہ کر اس کو وہیں ختم کر دیا اور بات کو آگے نہیں بڑھنے دیا۔ لیکن کتنے دکھ اور افسوس کی بات ہے کہ اُن کے بعض مخالفوں نے مرنے کے بعد بھی اُن کو معاف نہیں کیا، اور اُن کی بہتان طرازی کا سلسلہ اب تک جاری ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس طرح شرافتِ نفس کی کوئی حد نہیں ہے اسی طرح دنارتِ طبع کے لیے بھی کوئی قیدِ زمان و مکان نہیں ہے۔

پاکستان کی اطلاع ہے کہ اسلامیہ کالج لاہور کے طلباء کی بزمِ فروغِ اُردو کے جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر مولوی عبدالحق (بابائے اردو) نے اُردو زبان کے ساتھ اپنے والہانہ شغف کی داستان بیان کی اور اس سلسلہ میں فرمایا:

"مرحوم مولانا ابوالکلام نے ایک مرتبہ مجھ کو بلا کر کہا کہ میں اُردو کی حمایت سے دست بردار ہو جاؤں، ورنہ میرے مکان میں ناجائز چرس یا افیون رکھ کر مجھ کو پکڑوا دیا جائے گا"

ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اس صریح کذب و افترا کے متعلق کیا کہیں؟ اول تو ہر شخص جانتا ہے کہ یہ لب و لہجہ، یہ طرزِ گفتگو اور یہ تیور ہرگز ہرگز مولانا کے نہیں ہو سکتے۔ پھر وہ بھی

اردو کی حمایت کے معاملہ میں۔ کسے نہیں معلوم کہ مولانا کا فضل وکمال، ان کا ادبی امتیاز اور خاص فن جو کچھ بھی ہے اُردو میں ہی ہے، وہ عمر بھر صرف اسی ایک زبان میں لکھتے اور بولتے رہے، اس بناء پر یہ کیوں کر باور کیا جا سکتا ہے کہ اُردو زبان کا ہر قدردان تو ڈاکٹر عبدالحق کی اردو کے لیے انتہائی مخلصانہ اور مجاہدانہ سرگرمیوں کا مداح اور معترف ہو اور مولانا ابوالکلام موصوف کو اُردو کی حمایت سے باز آجانے کی تاکید کریں۔

نہ صرف مولوی عبدالحق بلکہ اُن کی انجمن ترقی اردو سے بھی مولانا کو وہی تعلقِ خاطر تھا جو ایک اُردو کے سچے محب اور اُس کے قدردان کو ہونا چاہیے، چنانچہ کل ہند اُردو کانفرنس جو دسمبر ۱۹۳۹ء میں انجمن ترقی اردو کے زیرِ اہتمام و انتظام دہلی میں منعقد ہوئی تھی اور جس کے صدر نواب مہدی یار جنگ بہادر تھے۔ اس کی مطبوعہ رپورٹ اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ اس رپورٹ کے صفحہ ۴۰ پر مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ پیغام درج ہے:

"کانفرنس کے لیے پوری کامیابی کی دعا کرتا ہوں۔ اُردو چھپائی کے لیے ٹائپ کی ضرورت فی الوقت سب سے اہم ہے۔ کانفرنس کو اس کی سفارش کرنا چاہیے کہ اردو کے اخبارات و رسائل نسخ ٹائپ اختیار کریں۔"

مولانا نے اس پیغام میں رسمی طور پر کانفرنس کے لیے کامیابی کی دعا ہی نہیں کی ہے۔ بلکہ ایک مشورہ بھی دیا ہے جو اردو چھپائی کی عمدگی اور خوبی کے لیے مولانا کے نزدیک بہت اہم اور ضروری ہے۔ یہ مشورہ دینا خود اس بات کی دلیل ہے کہ مولانا کو اردو کانفرنس کے مقاصد کے ساتھ دلی ہمدردی تھی۔

علاوہ ازیں کون نہیں جانتا کہ ۱۹۴۷ء میں جب انجمن ترقی اردو (ہند) کا دفتر واقع دریا گنج برباد و غارت ہو گیا تھا اور مولوی عبدالحق اردو کی قسمت کو اردو دشمنوں کے حوالہ کر کے پاکستان چلے گئے تھے تو ان حالات میں صرف ایک مولانا ہی تھے جنھوں نے انجمن ترقی اُردو کی گری ہوئی عمارت کو پھر کھڑا کیا، اور اس طرح اس کو حیاتِ نو بخشی۔ پھر دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ انجمن ترقی اُردو علی گڑھ۔ مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ، ساہتیہ اکاڈمی نئی دہلی وغیرہ میں بصرف زرِ کثیر اردو زبان ہیں اور اردو کے لیے جو کام ہو رہے ہیں کسے خبر نہیں ہے کہ ان سب کاموں میں مولانا مرحوم کی کوشش، توجہ اور دل چسپی کو کتنا بڑا دخل ہے۔

مولوی عبدالحق کو اردو زبان کے ساتھ جو عشق و شغف ہے اور موصوف نے جس طرح تن من دھن سے اس زبان کی عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں، اُن کے پیشِ نظر وہ بجا طور پر "بابائے اُردو" کے خطاب کے مستحق ہیں۔ موصوف نے اردو کی خدمت کے لیے جدوجہد، ایثار و قربانی اور بے نفسی و بے لوثی کا ایک ایسا ریکارڈ قائم کر دیا ہے جو ادبِ اردو کی تاریخ میں ان کا نام روشن رکھے گا با ایں ہمہ موصوف نے اردو تحریک کو ملک میں جس طرح چلایا اُس کا ایک ناخوشگوار پہلو یہ بھی تھا کہ وہ اردو تحریک کو سیاست سے الگ رکھ کر اس کو جمہوری اور عوامی تحریک کی حیثیت سے نہیں چلا سکے، چنانچہ اس کا اثر یہ ہوا کہ اردو ہند میں ہندی کی اور پاکستان میں بنگالی زبان کی حریف سمجھی جانے لگی اور اس ایک غلط فہمی کی وجہ سے آج اُردو کو ہند اور پاکستان دونوں ملکوں میں تقریباً ایک ہی قسم کی مشکلات پیش آ رہی ہیں۔ اردو تحریک کا یہ انداز مولانا ابوالکلام آزاد کی رائے میں سرتاسر غلط تھا اور تجرباتِ مابعد نے ثابت بھی کر دیا کہ اس معاملہ میں مولانا کی رائے ہی درست تھی۔ اس بنا پر ہمارا خیال ہے اگر مولانا نے مولوی صاحب سے صرف اتنی بات کہی ہوگی کہ وہ اردو تحریک کو جس ڈگر پر چلا رہے ہیں وہ صحیح نہیں ہے اُس سے اُردو کو نقصان پہنچ جائے گا۔ مولوی صاحب نے مولانا کی اسی بات کو اپنے مخصوص اندازِ گفتگو میں بیان کر دیا ہے[1]، اسی قسم کے مواقع کے لیے فرمایا گیا ہے۔ کفی بالمرء کذبا ان یحدث بکل ما سمع۔

(برہان دہلی۔ مارچ ۱۹۵۹ء)

---

[1] بابائے اردو نے مولانا پر اس الزام کی تردید کر دی تھی اور یہ کہ انھوں نے یہ بات ہی نہ کہی تھی۔

مولانا آزاد اور سید سلیمان ندوی

مولانا شبلی اور مولانا حالی دونوں ہم عصر تھے اور ایک دوسرے کے علم وفضل کا اعتراف کھلے دل سے کرتے تھے لیکن ان کے انتقال کے بعد خواہ مخواہ شبلی گروپ اور حالی گروپ کے نام سے اربابِ علم وادب کی دو جماعتیں بن گئیں، اور اس پر بحث کا ایک طویل سِلسلہ قائم ہوگیا کہ شبلی اور حالی میں کس کا مرتبہ اونچا ہے۔ اس بحث اور اُس کے متعلقات ولوازم کی وجہ سے جو تلخیاں اور ناگواریاں پیدا ہوئیں، اب تک بہت سے حضرات ان کو فراموش نہ کر سکے ہوں گے، کہ اب بعض حلقوں میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہما کے مقابلہ وموازنہ کے ایک جدید فتنہ نے سر اٹھایا ہے اور اس کی ناگواری اور تلخی شدت اختیار کرتی جارہی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ہر شخص کو تمام معاصر علماء وفضلاء کے ساتھ یکساں عقیدت وارادت نہیں ہوتی بلکہ اپنے اپنے مذاق ورجحانِ طبعی کے مطابق کسی سے کم عقیدت ہوتی ہے، اور کسی سے زیادہ اور کسی سے بالکل ہی نہیں ہوتی، لیکن منطق یا معقولات کا یہ کون سا اصول ہے کہ اپنے ہیرو کی عظمت اُس وقت تک ثابت ہی نہیں ہوسکتی جب تک کہ اُس کے معاصر کی قبائے علم وفضل کو داغدار نہ کیا جائے اور اس پر کیچڑ نہ اچھالی جائے۔ مولانا ابوالکلام اور سید صاحب دونوں اس دنیا سے رخصت ہوچکے ہیں، اس لیے یوں بھی اذکروا موتاکم بمحاسنهم کے حکم کے مطابق ضروری تھا کہ اس بحث سے گریز کیا جاتا۔ بشری کمزوریوں اور کوتاہیوں سے کون خالی ہے؟ قرآن میں فرمایا گیا ہے "اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ" اس لیے سلامت روی کا تقاضا یہ ہے کہ خالص علمی تنقید سے قطع نظر جہاں تک ذاتی اوصاف وعادات کے ذکر کا تعلق ہے، اچھائیاں بیان کی جائیں اور برائیوں سے کفِ لسان کیا جائے۔

ایک معاشرہ، صالح معاشرہ اسی وقت رہ سکتا ہے۔ جب کہ شرافت وانسانیت کے ان مقتضیات کی اس میں رعایت کی گئی ہو۔ پھر لطف یہ ہے کہ ان دونوں مرحومین کے ساتھ بعض حضرات نے مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کو بھی گھسیٹ بلایا ہے اور ان کو بھی مولانا ابوالکلام آزاد کے رقیب کی حیثیت سے پیش کیا جا رہا ہے۔

صورتِ حال یہ ہے کہ ایک پاکستانی ماہنامہ کے مدیر شہیر[۱] نے گزشتہ مارچ کی اشاعت میں مولانا ابوالکلام آزاد کا تذکرہ سخت ناشائستہ اور توہین انگیز الفاظ میں کیا ہے، جس کو پڑھ کر مولانا امین احسن اصلاحی بھی تڑپ اٹھے ہیں، اور انھوں نے اپنے جریدے میثاق میں اس پر شدید غیظ وغضب اور حد درجہ غم وغصہ کا اظہار کیا ہے، اور پاکستانی معاصر نے جو باتیں مولانا کی نسبت ناشائستہ لب ولہجہ میں کہی تھیں اُن سب کا ایک ایک کر کے مُسکت جواب دیا ہے۔ یاد ہوگا اسی معاصر نے مولانا کی زندگی میں بھی مولانا کے متعلق اسی طرح کا ایک انتہائی دِل آزار اور توہین انگیز مضمون ۵۲ء میں شائع کیا تھا جس کی نسبت بعض محرمانِ اسرارِ نہانی کا خیال ہے کہ معاصر نے یہ مضمون خود نہیں لکھا تھا۔ بلکہ وہ مَلاُ اعلیٰ کی طرف سے القاء فی النفس کا نتیجہ تھا۔ بہرحال حقیقت جو کچھ بھی ہو، غالباً مولانا کی زندگی میں جو مضمون لکھا گیا تھا وہ بادہ بقدر ظرف نہیں تھا کہ اب ان کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد رہی سہی کسر کو پورا کرنے کی سوجھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک شخص کا ظرف کس قدر وسیع ہے؟ اور اسلامی تعلیمات کا اثر اس کی طبیعت پر کتنا ہے؟ اس کا صحیح اندازہ اس وقت نہیں ہوتا جب کہ وہ اپنے کسی ممدوح کی نسبت کلام کرتا ہے بلکہ اُس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ کسی ایسے شخص کے بارہ میں لب کشائی کرتا ہے جسے وہ پسند نہیں کرتا۔

یہ تو تصویر کا ایک رخ ہوا۔ دوسرا رخ یہ ہے کہ ایک صاحب نے محنتِ شاقہ انگیز کر کے (جس کی واقعی داد نہ دینا ظلم ہے) ایک طویل "محققانہ" مضمون لکھا ہے اور اس ساری ریسرچ کا حاصل یہ ہے کہ الہلال کا مطبوعہ مضمون "مشہدِ اکبر" سید صاحب کا

---

[۱] مولانا ماہر القادری مرحوم مدیر فاران کراچی کی طرف اشارہ ہے۔

نہیں بلکہ مولانا ابوالکلام کا تھا۔ اس کے بعد ایک صاحب کو جوش آیا اور انھوں نے بتایا کہ الہلال میں "اسلام اور اشتراکیت" کے عنوان سے جو مقالہ سید صاحب کے نام سے چھپا تھا وہ دراصل مصر کے ایک اہل قلم کے مضمون کا ترجمہ تھا، اور سید صاحب نے بلا حوالہ کے اسے اپنی طرف منسوب کر لیا تھا۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ اس قسم کی خوردہ گیری کا مقصد کیا ہے؟ اول تو مذکورۂ بالا دونوں امور میں گفتگو کی گنجایش اب بھی باقی ہے۔ لیکن اگر فرض کر لیا جائے کہ دونوں ہی باتیں درست ہیں تو اب سوال یہ ہے کہ ان سے سید صاحب کی اُس عظمت پر کیا اثر پڑا جو انھیں بلند پایہ محقق اور مصنف ہونے کی حیثیت سے حاصل ہے۔ ظاہر ہے سید صاحب کی عظمت کا دارومدار ان دو مضمونوں پر نہیں۔ بلکہ ارض القرآن، عرب و ہند کے تعلقات، خیام، سیرت النبی وغیرہ کتابوں اور سیکڑوں بلند پایہ تحقیقی مقالات و مضامین پر ہے۔ پھر یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ خود ان دونوں بزرگوں کے باہمی تعلقات کس درجہ خوشگوار اور دوستانہ تھے۔ سید صاحب نے معارف میں اپنے قلم سے مولانا ابوالکلام کی اس قدر تعریف کی ہے کہ مولانا کا بڑے سے بڑا مداح بھی اس سے زیادہ نہیں کر سکتا، دوسری جانب اگرچہ مولانا کسی معاصر کی تعریف میں سخت کوتاہ قلم اور کوتاہ زبان واقع ہوئے تھے، اور اس پر وہ فخر بھی کرتے تھے۔ بایں ہمہ ان کو سید صاحب سے اور سید صاحب کے دارالمصنفین سے کیا تعلق تھا؟ اس کا اندازہ ان خطوط سے ہو سکتا ہے جو معارف میں شائع ہو چکے ہیں، اور نیز اس سے کہ مولانا نے شدید ترین مالی مشکلات کے زمانہ میں دارالمصنفین کی مدد کس جرأت اور فیاضی سے کی۔ اس بنا پر ان دونوں بزرگوں کے مرحوم ہو جانے کے بعد اب جو حضرات اس قسم کی تلخ اور ناگوار بحثیں اٹھا رہے ہیں، وہ نہ اس ذریعہ سے علم و ادب کی کوئی خدمت انجام دے رہے ہیں اور نہ ملت اسلامیہ کے ان دونوں گوہر ہائے تابندہ کے ساتھ انصاف کر رہے ہیں، بلکہ ان دونوں کی روحوں کے لیے تکلیف و اذیت کا سامان مہیا کر رہے ہیں، اب تک جو کچھ ہوا سو ہوا۔ لیکن اب آیندہ یہ سلسلہ بالکل ختم ہونا چاہیے، یہ سطور لکھنے کی ضرورت

اس لیے محسوس ہوئی کہ جہاں تک ہمیں معلوم ہے، دونوں طرف کافی اشتعال موجود ہے۔ رسالے لکھے جا رہے ہیں اور کتابیں تیار ہو رہی ہیں۔ خدانخواستہ اگر یہ فتنہ یہاں ختم نہیں ہوا۔ اور مزید برگ و بار لایا تو یہ مسلمانوں کی بڑی بدقسمتی کی نشانی ہوگا۔ اور اس کے اثرات شدید اور دور رس ہوں گے۔ والسلام علی من اتبع الهدیٰ۔

(برہان، دہلی۔ مئی ۱۹۶۰ء)

مولانا آزاد میموریل اکیڈمی۔ لکھنؤ

لکھنؤ میں چند برس سے مولانا ابوالکلام آزاد میموریل اکیڈمی، مولانا علی میاں کی صدارت میں قائم ہے۔ ۲۶ مارچ کو اس کا سالانہ جلسہ مغرب کے بعد گنگاپرشاد میموریل حال میں منعقد ہوا۔ علی گڑھ سے ڈاکٹر محمد اقبال انصاری، ڈاکٹر ریاض الرحمٰن خاں شیروانی اور پروفیسر محمد عثمان ادہمی کی معیت میں اس جلسے میں شریک ہوا بلکہ مولانا علی میاں کی تحریک پر صدارت میں نے ہی کی۔ الشیخ عبدالمنعم النمر وزیر اوقاف مصر کی قیادت میں جو وفد دیوبند آیا ہوا تھا خصوصی دعوت پر اس جلسے میں شریک تھا۔ جلسہ کا آغاز قاری عبدالباسط (مصر) کی سحر انگیز قراءت سے ہوا، اس کے بعد، الشیخ عبدالمنعم النمر نے جنھوں نے مولانا آزاد پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سندلی ہے عربی میں تقریر کی، اردو ترجمہ ساتھ ساتھ ہوا۔ پھر علی الترتیب مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی اور مرکزی وزیر جناب ضیاء الرحمٰن انصاری نے مولانا آزاد کو خراج عقیدت پیش کیا، آخر میں میں نے چند کلمات کہے اور ½ ۹ بجے قاری عبدالباسط کی دعا پر جلسہ ختم ہوگیا۔ جلسہ بہت شان دار رہا۔ ہال کے باہر بھی بڑا مجمع تھا۔ ایک سیمنار کا انتظام بھی تھا جس میں شرکت کے لیے دُور دور سے ارباب قلم اور دانشور آئے تھے۔ مگر بعض وجوہ سے وہ منعقد نہ ہوسکا۔ یونس صاحب خالدی اور عبدالجبار صاحب اکیڈمی کے بڑے سرگرم اور فعّال کارکن ہیں۔ اب اکیڈمی نے اپنے کاموں کی توسیع و ترقی کا ایک بڑا منصوبہ بنایا ہے، خدا کرے انھیں کامیابی ہو[1] اور مولانا ابوالکلام آزاد کا حق خاطر خواہ طور پر ادا ہوسکے۔

(برہان، دہلی۔ مئی ۱۹۸۰ء)

---

[1] اکیڈمی نے "ابوالکلام آزاد (احوال و آثار)" کے عنوان سے مقالات کا ایک نہایت عمدہ مجموعہ شائع کردیا ہے

ہندوستان میں مسلمان اور فرقہ وارانہ سیاست

(۱)

حصول آزادی کے چند ماہ بعد ہی مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھنؤ میں مسلمانوں کا جو ایک نہایت اہم اور عظیم الشان کنونشن منعقد کیا تھا اُس میں مولانا نے بڑی صراحت اور صفائی سے فرمایا تھا کہ اب ہندوستان میں فرقہ وارانہ سیاست کے لیے پروان چڑھنے اور پنپنے کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ اس لیے مسلمانوں کے فرقہ وارانہ سیاسی اداروں کو میرا مشورہ یہ ہے کہ اب وہ اپنے کاموں کو مسلمانوں کے مذہبی اور سماجی و ثقافتی امور و مسائل تک محدود رکھیں اور اگر وہ سیاسی کام کرنا چاہیں تو اس مقصد کے لیے مشترکہ اور جمہوری ادارے قائم کریں، اس سلسلے میں مولانا نے ایسے مشترکہ سیاسی پلیٹ فارم کا نام تجویز کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا تھا: "مثلاً انجمن اتحاد و ترقی"

فرقہ وارانہ سیاست کے جو عظیم نقصانات اور اس راہ میں جو خطرات ہیں مولانا نے تقریر میں ان پر بھی سیر حاصل روشنی ڈالی تھی۔ کنونشن کے اس خطابِ عام کے علاوہ راقم نے متعدد پرائیویٹ مجلسوں میں بھی بعض اکابر زعماء و علماء کی موجودگی میں مولانا ابوالکلام آزاد کو ان کے مخصوص لب و لہجہ میں یہ فرماتے سُنا ہے کہ جہاں تک مسلمانوں کے مذہب اور ان کے کلچر کا سوال ہے مسلمانوں کو اس پر سختی سے عامل اور ان کی تبلیغ و اشاعت میں کوشاں رہنا چاہیے، اور اس معاملے میں کسی کے ساتھ Compromise کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیوں کہ ملّی تشخص کا تعین اس کے بغیر ممکن نہیں ہے، البتہ ایک جمہوری ملک میں اقلیت کے لیے فرقہ وارانہ سیاست کی راہ بڑی خطرناک ہے۔ اس سے اجتناب ضروری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تقسیم سے پہلے مسلمانوں کی فرقہ وارانہ سیاست سے ان کو فائدہ ہوا یا نقصان؟ اس سے بحث نہیں اور نہ ابھی وقت آیا ہے کہ اس سوال کا کوئی قطعی جواب معلوم ہو سکے، لیکن اس میں شبہ نہیں ہو سکتا کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے اس سے بہتر کوئی دوسرا مشورہ نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ مسلمانوں نے مولاناؒ کے مشورے کی ذرا پروا نہیں کی، انھوں نے اسے اس کان سُنا اور اُس کان اڑا دیا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تقسیم کے بعد سے اب تک زمین و آسمان زیر و زبر ہوگئے لیکن مسائل جو ملک کی سیاست کا جزء لاینفک ہیں اور جن کو پارلیمنٹری سیاست کہتے ہیں، ان پر بھی غور و فکر کرنے کا مسلمانوں کا ڈھنگ نہیں بدلا۔ ان کا یہ ڈھنگ فرقہ وارانہ طرزِ فکر کی آمیزش سے اب تک یکسر مبرّا اور پاک و صاف نہیں ہو سکا ہے، چناں چہ مسلم لیگ اب تک قائم ہے۔ تقسیم کے بعد ایک نئی سیاسی جماعت بنی تو اس کا نام بھی "مسلم مجلس" ہوا۔ کوئی بتائے کہ ان دونوں جماعتوں نے اب تک مسلمانوں کی کونسی اور کیسی قابلِ ذکر خدمت انجام دی ہے، یا ان سے مستقبل میں کس فائدے کی توقع کی جا سکتی ہے؟ مسلم مجلس مشاورت کا آغاز بڑے طنطنے اور جوش و خروش سے ہوا تھا۔ لیکن اس نے بھی مسلمانوں کی کیا خدمات انجام دیں اور اب وہ ہے بھی تو کہاں ہے؟

اس مجلس کے صدر سے میں نے بارہا کہا کہ اس کے نام سے "مسلم" کا لفظ نکال دیا جائے تو یہ زیادہ فعّال اور متحرک ہو سکتی ہے، اور جناب صدر نے ہر بار مجھ سے ذاتی طور پر اتفاق رائے بھی کیا، لیکن ساتھ ہی معذرت بھی کی کہ ان کے ساتھی اس کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔

ان تمام باتوں سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو مولانا ابوالکلام آزادؒ نے جو مشورہ دیا تھا انھوں نے اس کی پروا نہیں کی، اور اس کی روشنی میں اب تک اپنا کوئی ایسا سیاسی موقف متعین نہیں کر سکے ہیں جو ان کے لیے ضروری ہے، ہمارے نزدیک ان کی موجودہ شکایات کا ایک بڑا سبب یہی ہے۔ (برہان دہلی۔ اپریل ۱۹۸۲ء)

(۲)

ایک بات بڑی اہم اور توجہ طلب یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تقریر میں جس کا حوالہ گزشتہ ماہ کے نظرات میں دیا گیا ہے یہ فرمایا کہ "اگر مسلمان سیاسی کام کرنا چاہیں تو مثلاً انجمن اتحاد و ترقی کے نام سے ایک مشترکہ اور غیر فرقہ وارانہ جماعت بنائیں" اب سوال یہ ہے کہ اس وقت ملک میں کانگریس جس کے ایک بلند پایہ رکن خود مولانا بھی تھے، اس کے علاوہ اور بھی متعدد سیاسی سیکولر پارٹیاں سرگرم عمل تھیں تو پھر مولانا نے یہ کیوں نہیں فرمایا: "اگر مسلمان سیاسی کام کرنا چاہیں تو کانگریس یا کسی سیاسی پارٹی میں شریک ہو جائیں" ہمارے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک طویل اور نہایت فعّال و متحرک سیاسی زندگی بسر کرنے کے بعد غالباً مولانا افسوس اور دکھ سے یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ ملک میں جو سیاسی پارٹیاں کام کر رہی ہیں، مجموعی اعتبار سے وہ اس صدق و صفائے باطنی اور اخلاصِ فکر و عمل سے تہی مایہ ہیں جو ملک و قوم کی بے لوث و بے غرض خدمات انجام دینے کے لیے شرطِ اوّل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مولانا کو اس بات کا صدمہ اور رنج تھا کہ اب پارلیمنٹ یا اسمبلی کی ممبری اور وزارت کی کرسی، یہ دونوں چیزیں جلبِ منفعت اور حصول ذاتی عزت و وجاہت کا ذریعہ و وسیلہ اور آلۂ کار بنتی جا رہی ہیں اور تو اور جب سے انھیں محسوس ہونے لگا تھا کہ کانگریس میں گاندھی اور نہرو کی روح کمزور اور پٹیل کی روح قوی تر ہوتی جا رہی ہے ــــــ مولانا اخیر میں کانگریس سے بھی بددل ہو چلے تھے۔ چنانچہ ان کی کتاب انڈیا ونس فریڈم اس کی شاہدِ عدل ہے۔ اس بنا پر اگر بوڑھے اور ضعیف و کمزور ہو جانے کی وجہ سے گاندھی کی طرح اپنے دیرینہ رفقا سے الگ ہونے کا خیال دامن گیر نہ ہوتا تو اغلب یہ ہے کہ مولانا اپنی ایک نئی سیاسی پارٹی الگ بناتے۔ ظاہر ہے سیاسی جماعتوں کا یہ خود غرضانہ طریقِ عمل اسلامی اصولِ حیات کے خلاف ہے، اس وجہ سے مولانا کا غالباً منشا یہ تھا کہ مسلمان خود اقدام کریں، اور ایک مشترکہ سیاسی پلیٹ فارم بنائیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر مسلمان مولانا ابوالکلام آزاد کے مشورہ پر عمل کرتے اور ان کے منشا کے مطابق اپنے ہم خیال و ہم مسلک برادرانِ وطن کے اشتراک و تعاون سے اپنی ایک سیاسی پارٹی الگ بناتے، اس کے لیے عزم و استقلال اور ہمت و جرأت سے کام کرتے اور سیاست کا رشتہ اخلاق، ایمانداری اور دیانت سے منقطع نہ ہونے دیتے تو وہ ملک میں ایسے بے یار و مددگار نظر نہ آتے جیسے کہ اب نظر آرہے ہیں۔

توبخویشتن چہ کردی کہ بما کنی نظیری　　　بخدا کہ واجب آمد زتو احتراز کردن

(برہان، دہلی۔ مئی ۱۹۸۳ء)

برہان کے تبصرے چار قسموں میں مرتب کیے گئے ہیں :

الف : حضرت مولانا کے قلم سے نکلی ہوئی تحریرات و تصنیفات بہ شمولِ خطبات

ب : حضرت مولانا کے افکار پر مبنی تالیفات ۔ خواہ ان کا درجۂ صحت کچھ ہو، مولانا کے افکار کے باب میں ان کا درجہ استناد ثانوی ہی قرار پائے گا ۔

ج : حضرت مولانا پر دیگر حضرات کی تصنیفات و تالیفات ۔

د : وہ تصنیفات و تالیفات جو الف، ب، ج کسی کے ذیل میں نہیں آتیں، لیکن ان کا حوالہ ضروری سمجھا گیا ۔ مثلاً : ڈاکٹر سید عبداللطیف کا انگریزی ترجمۂ قرآن ——— اس میں ڈاکٹر صاحب مرحوم نے مولانا آزاد کے ترجمان القرآن کے بقیہ بارہ پاروں کے ترجمے کی، اپنے ذوق کے مطابق تکمیل کی ہے ۔

(الف)

ترجمان القرآن (جلد اول) :

مصنف : مولانا ابوالکلام آزاد ۔

تقطیع : متوسط، ضخامت : ۵۹۴ صفحات، ٹائپ جلی اور روشن ۔

قیمت : مجلد بائیس روپے ۔ پتا : ساہتیہ اکادمی ۔ رابندرا بھون، نئی دہلی ۔

کتاب "ترجمان القرآن" مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیفات میں ایک شاہ کار کی حیثیت رکھتی ہے جو علمی و مذہبی دنیا میں ان کے لیے بقائے دوام کی ضامن ہے، اس کتاب کے دو ایڈیشن طبع ہو کر مقبولِ عوام و خواص ہو چکے ہیں، لیکن مولانا کی وفات کے بعد ساہتیہ اکادمی نے

نوٹ : برہان میں مدیر (مولانا سعید احمد اکبر آبادی) کے علاوہ کبھی کبھی حضرت مفتی عتیق الرحمن مرحوم بھی کتابوں پر تبصرے فرماتے تھے ۔ تبصروں کے آخر میں تبصرہ نگار کے لیے سؔ، عؔ ۔ ر اور سؔ ۔ عؔ کی جو علامتیں استعمال ہوئی ہیں، ان میں سؔ سے سعید احمد، عؔ ۔ ر سے عتیق الرحمن اور سؔ ۔ عؔ سے مراد سعید (احمد اکبر آبادی) و عتیق الرحمن، رحمہما اللہ، دونوں بزرگ ہیں ۔ یہ وضاحت پروفیسر محمد اسلم (لاہور) نے فرمائی ہے ۔

یہ طے کیا کہ وہ مولانا کی سب کتابیں اور تحریریں خاطر خواہ اہتمام و انتظام کے ساتھ از سرِ نو شائع کرے گی، چنانچہ یہ کتاب اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ یہ صرف مقدمہ اور سورۂ فاتحہ کی تفسیر پر مشتمل ہے، اسی طرح پوری کتاب تین جلدوں میں شائع ہوگی۔ اس میں شک نہیں کتاب اس اہتمام سے چھپی ہے کہ اس کا حق ادا ہوگیا ہے۔ مصر کے چھپے ہوئے ایک قرآن مجید جو شیخ جامعۂ ازہر کی نگرانی میں طبع ہوا تھا اُس کے مطابق آیات پر نمبر ڈالے گئے ہیں، اُن کے اعراب کی تصحیح کی گئی ہے۔ اُردو الفاظ کے املا میں جو غلطیاں یا ناہمواری تھی انھیں درست اور ہموار کیا گیا ہے، یورپین مصنفین اور اُن کی تصنیفات کے نام رومن حرفوں میں بھی لکھ دیے گئے ہیں، اُردو عبارت کے رموز واوقاف میں بھی باقاعدگی کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ ترجمان القرآن کے پہلے دونوں ایڈیشنوں میں حک و فک اور ترمیم و تنسیخ کے جو اختلافات تھے اس اڈیشن میں اُن سب کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ تاکہ قاری کو مولانا کے ذہنی اور فکری ارتقاء کا اندازہ ہو سکے، اسی طرح مولانا نے اس سلسلے میں چھوٹی بڑی جو تحریریں الگ شائع کی تھیں وہ بھی سب اس میں شامل کر دی گئی ہیں۔ حواشی ہر صفحہ پر نہیں ہیں، بلکہ دونوں اڈیشنوں کے حواشی صفحات کے نمبر کے ساتھ آخر میں ایک ساتھ درج کیے گئے ہیں۔ آخر میں اشخاص و قبائل کے ناموں کی فہرست اور شروع میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے قلم سے پیش لفظ ہے۔

اربابِ علم و ذوق کو اکادمی کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اُس کی سعی اور جدوجہد سے ترجمان القرآن کا اس قدر اعلیٰ اڈیشن معرضِ وجود میں آگیا۔ لیکن اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ سرسری طور پر الٹ پلٹ کرنے سے معلوم ہوا کہ خود مولانا سے بعض جگہ جو فاش غلطی ہوگئی تھی اس اڈیشن میں نہ اُس کی تصحیح کی گئی ہے، اور نہ اُس پر کوئی نوٹ دیا گیا ہے۔ مثلاً الدین کی بحث میں صفحہ ۲۱۰ کی آخری سطر میں عربی کا جو شعر درج ہے۔ مولانا نے اس کے پہلے مصرع "ستعلم لیلیٰ ای دین تداینت" میں لفظ دین کو دال کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حالانکہ یہ دال کے فتحہ کے ساتھ اور قرض کے معنی میں ہے۔ تعجب ہے ڈاکٹر عبدالمعید خاں اور پروفیسر اجمل خاں جن کی نظرِ ثانی کے بعد یہ اڈیشن طبع ہوا ہے، اُن میں سے کسی کو اس غلطی پر تنبّہ نہیں ہوا، جسے عربی کا ایک بتدی بھی اول نظر میں محسوس کر سکتا ہے۔

(برہان، نومبر ۱۹۶۰ء)

ترجمان القرآن (جلد دوم) :

مصنف : مولانا ابوالکلام آزادؒ

تقطیع : متوسط ضخامت : ۴۸۸ صفحات، ٹائپ جلی۔ طباعت اور کاغذ اعلیٰ۔

قیمت : مجلد ۲۲ روپے۔ پتا : ساہتیہ اکادمی۔ رابندرا بھون، نئی دہلی۔

ساہتیہ اکادمی نئی دہلی نے مولانا ابوالکلام آزادؒ کی تمام کتابوں اور تحریروں کو نہایت اعلیٰ انتظام اور اہتمام کے ساتھ شائع کرنے کا جو منصوبہ بنایا ہے یہ کتاب اُس سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔ اس سے پہلے اسی کتاب کی پہلی جلد جو سورۂ فاتحہ کی تفسیر پر مشتمل ہے، شائع ہو کر سرمۂ اہلِ بینش و نظر ہو چکی ہے۔ ترجمان القرآن اصلاً تین جلدوں میں شائع ہوا تھا۔ اکادمی نے مطالعے کی سہولت کی خاطر جلد اوّل کو تو یوں ہی رہنے دیا ہے۔ باقی دو جلدوں کی چار جلدیں بنادی ہیں۔ جن میں سے پہلی جلد یہ ہے جو سلسلے کی جلد دوم ہے اور سورۂ بقرہ سے سورۂ انعام تک کے ترجمے اور تفسیری حواشی پر محیط ہے۔ اکادمی نے جو اہتمام کیا ہے اُس کی وجہ سے کتاب ماڈرن طریقے پر بالکل اَپ ٹو ڈیٹ ہوگئی ہے۔ چنانچہ شروع میں ۱۸ صفحات میں مضامین کی فہرست ہے۔ اس کے بعد متنِ کتاب کی خاتمے پر ۵۸ صفحات میں اُن تمام عبارتوں کی فہرست ہے جو کتاب کے پہلے اور دوسرے اڈیشنوں میں گھٹی یا بڑھی ہیں۔ اس کے بعد اشاریہ ہے۔ نفس کتاب جس پایہ کی ہے اُس کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے کم از کم اردو میں یہ پہلی تفسیر ہے جس میں قرآن کو اُس کی اصل اسپرٹ میں (کلامی، فقہی اور فنی مباحث سے بلند رکھ کر) سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اکادمی اس اہتمام پر شکریے کی مستحق ہے۔

غبارِ خاطر : از مولانا ابوالکلام آزاد۔

مرتب : جناب مالک رام۔

تقطیع : متوسط۔ ضخامت : ۴۱۰ صفحات، کتابت و طباعت و کاغذ اعلیٰ۔

قیمت : مجلد دس روپے۔

یہ وہی اردو ادب و انشا کی مشہور و معروف شاہ کار کتاب ہے، جس کو مولانا ابوالکلام

آزاد احمد نگر جیل سے اربابِ ذوق ونظر کے لیے اک ارمغانِ گراں ساماں کے طور پر ساتھ لائے تھے۔ ساہتیہ اکادمی کی طرف سے اُردو زبان کے نامور محقق اور ادیب مالک رام صاحب نے اس کتاب کو جس محنت اور عرق ریزی سے ایڈٹ کیا ہے اُس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ غبارِ خاطر میں کم وبیش ہر پیراگراف میں عربی، فارسی یا اُردو کا کوئی شعر ہے۔ یا کسی مشرق یا مغرب کے مصنّف اور اُس کی کسی عبارت یا اُس کی کسی رائے کا تذکرہ وبیان ہے۔ مالک رام صاحب نے ان سب کی (باستثنائے چند) تخریج کی ہے اور اُن کے مکمل حوالے نقل کیے ہیں۔ یہ حواشی سو صفحات میں پھیلے ہوئے ہیں جن میں مُرتّب نے اُن بعض مسامحات کی تصحیح بھی کر دی ہے جو مولانا سے ارتجالاً اور محض اپنے حافظے پر اعتماد کر کے لکھنے کی وجہ سے سرزد ہو گئے تھے۔ اس کے بعد پانچ فہرستیں بترتیب ذیل ہیں:

(۱) فہرستِ اعلام ۷ صفحات (۲) فہرستِ بلاد واماکن ۴ صفحے (۳) فہرستِ آیاتِ قرآنی ۲ صفحے (۴) کتاب کے متن میں جن کتابوں کے نام آئے ہیں اُن کی فہرست ۲ صفحے (۵) حواشی کے مآخذ کی فہرست ۹ صفحے جن میں پونے دو سو عربی فارسی اردو انگریزی کی کتابوں اور چند رسائل کا مکمل تذکرہ ہے۔ اس شکل وصورت میں غبارِ خاطر کا یہ اڈیشن علم وادب کے اصحابِ ذوق کے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ اور تحفہ شائگان بن گیا ہے۔

(برہان، اگست ۱۹۶۷ء)

کاروانِ خیال:

مصنّف: مولانا ابوالکلام آزادؒ۔

تقطیع: خورد، ضخامت: ۱۵۱ صفحات: کتابت وطباعت بہتر۔

قیمت: مجلد عام ۸/

شائع کردہ: منیجر صاحب اخبار مدینہ بجنور (یوپی)

مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط کا ایک مجموعہ "غبارِ خاطر" کے نام سے شائع ہو کر مقبولِ

عوام و خواص ہو چکا ہے ۔ یہ کتاب مولانا کے خطوط کا دوسرا مجموعہ ہے، اور اگرچہ غبار خاطر کی بہ نسبت مختصر ہے، لیکن اس کی چند خصوصیات اس کو سابق مجموعے سے ممتاز کرتی ہیں ۔ مثلاً یہ کہ غبار خاطر کے خطوط حقیقی نہیں بلکہ فرضی اور تخیلی تھے کیوں کہ مولانا احمد نگر جیل میں ان کو مکتوب الیہ سے عالم خیال میں مخاطب ہو کر لکھتے رہے تھے اور جب رہا ہوئے تو ان کو کتابی شکل میں چھپوا کر مکتوب الیہ کے پاس بھیج دیا ۔ اس کے برخلاف اس مجموعے کے سب خطوط واقعی اور حقیقی خطوط ہیں پھر اس میں کاتب خطوط کے علاوہ مکتوب الیہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے خطوط بھی شریک اشاعت ہیں جن کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ واقعی ابوالکلام ایسے کاتبِ خطوط کا مکتوب الیہ نواب شیروانی ایسی ہی شخصیت کو ہونا چاہیے تھا جو اسلوبِ نگارش اور طرزِ انشاء میں جس طرح ان کا جواب ہیں ۔ افتادِ طبع اور خصوصیاتِ مزاجی میں بھی ان سے کچھ کم نہیں، مولانا ابوالکلام عمر میں بہت خورد ہونے کے باوجود نواب صاحب کو "صدیق مکرم" سے مخاطب کرتے ہیں جو طبیعت پر سخت گراں گزرتا ہے ۔ لیکن مولانا شیروانی جواب میں "حبیب نواز" "آشنا پرور" کرم طراز وغیرہ ایسے القاب لکھ کر اپنی بزرگی کی لاج رکھ لیتے ہیں، اور اس سے پڑھنے والے کی گرانیِ طبیعت قدرے کم ہو جاتی ہے ۔

علاوہ بریں بڑی بات یہ ہے کہ اصلی ہونے اور بیساختہ لکھے جانے کی وجہ سے ان خطوط میں آمد کا رنگ بہ نسبت آورد کے غالب ہے یہ مجموعہ بھی غبارِ خاطر کی طرح ادب و انشا اور اردو تحریر و کتابت کا ایک بہترین اور دل چسپ نمونہ ہے ۔ شروع میں مرتبِ خطوط مولوی عبدالشاہد کا ایک مبسوط مقدمہ ہے، جس میں انھوں نے کاتب و مکتوب الیہ دونوں کو دل کھول کر ان کے حسنِ انشا اور زورِ قلم پر داد تحسین و آفریں دی ہے، اور ان کے یہاں اپنے تقرب کی داستان سنائی ہے ! بہرحال مقدمہ بھی افادیت سے خالی نہیں ۔

(برہان، جولائی ۱۹۴۸ء)

تذکرہ : از مولانا ابوالکلام آزاد۔

مرتب : جناب مالک رام۔

تقطیع : متوسط، ضخامت : ۵۴۱ صفحات، کتابت وطباعت اور کاغذ اعلیٰ۔

قیمت : -/۱۵ روپے۔ پتا : ساہتیہ اکادمی۔ رابندرا بھون۔ نئی دہلی۔

یہ وہی مشہور و معروف کتاب ہے جسے مولانا نے رانچی میں نظر بندی کے زمانے میں ۱۹۱۶ء میں قلم برداشتہ چند ماہ کے اندر اندر اپنی سوانح عمری کے حصۂ اول کے طور پر لکھا تھا۔ اور اس زمانہ میں جب یہ چھپ چھپا کر منظر عام پر آئی تھی تو گویا اردو ادب وانشا کی دنیا میں بھونچال سا آگیا تھا۔ ساہتیہ اکادمی نے مولانا کی تمام کتابوں کو تحقیق و ترتیب کے جدید اصول و ضوابط کے ماتحت شائع کرنے کا جو پروگرام بنایا ہے۔ یہ کتاب اسی سلسلے کی تیسری کڑی ہے اور مرتب ہیں مالک رام صاحب۔ انھوں نے جو محنت شاقہ برداشت کی ہے اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ پوری کتاب ۲۳۹ صفحات پر آئی ہے اور کچھ کم اتنے ہی صفحات پر فاضل مرتب کے قلم کا لکھا ہوا مقدمہ اور حواشی پھیلے ہوئے ہیں۔ پھر جن حضرات نے اصل کتاب کو پڑھا ہے ان کو اندازہ ہوگا کہ اس کتاب میں شعر وادب، تاریخ و فلسفہ، مذہب و تصوف اور اخلاق و سیاست کا ایسا کون سا میدان ہے جس میں مولانا کے اشہب قلم نے جولانیاں نہ دکھائی ہوں۔ اس بنا پر اس کتاب کے حواشی لکھنا اور ہر چیز کی تخریج کرنا جوئے شیر لانے سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ شروع میں جو مقدمہ ہے وہ اگرچہ مختصر ہے۔ لیکن ٹھوس اور معلومات افزا ہے۔ اس مقدمے سے پہلی مرتبہ ہم کو مولانا کی بارہ تیرہ مزید تصنیفات کا علم ہوا۔ البتہ صفحہ ۱۲ پر امامت کی وادی پر خار سے دامن بچا کر نکل جانے پر مولانا آزاد کو جو داد دی گئی ہے۔ اس کے سلسلے میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ مولانا خود اس سے دست کش نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ علمائے دیوبند کی سخت مخالفت کے باعث دہلی کے ایک عظیم الشان جلسہ میں مولانا کی امامت کا رزولیوشن منظور نہ ہوسکا تھا، مولانا کو طبعی طور پر اس کا بڑا صدمہ ہوا۔ اور غالباً اسی بددلی اور بیزاری کا اثر تھا کہ انھوں نے اپنا راستہ بدل دیا۔ بہرحال جدید تحقیق و ترتیب اور تحشیہ کے بعد علمی اور ادبی اعتبار سے یہ کتاب اور زیادہ

قابلِ قدر ہو گئی ہے۔ (برہان، دسمبر ۱۹۶۸ء)

خطباتِ آزاد:

مرتب: جناب مالک رام۔

کتابت طباعت بہتر، ضخامت: ۳۶۴ صفحات، تقطیع متوسط،

قیمت: مجلد: ۱۸ روپے۔ پتا: ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی۔

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم انشا اور خطابت دونوں کے بادشاہ تھے۔ خطابت کے لیے فنی طور پر جو ظاہری حسن و جمال اور صوری رعنائی و دلکشی درکار ہے، قدرت نے انھیں اس تک سے بحصۂ وافر نوازا تھا، ان کی خطابت جادو جگاتی اور طوفان اٹھاتی تھی، وہ کبھی رعد و برق کی گرج تھی اور کبھی نسیم سحر کی موجِ حیات آفریں، وہ صورِ اسرافیل بھی تھی اور زعفران زار کشمیر بھی، ساہتیہ اکادمی نے مولانا کے تمام سرمایۂ تحریر و تقریر کو نہایت اہتمام اور کمالِ حُسنِ سلیقہ سے اشاعت پذیر کرنے کا جو پروگرام بنایا ہے اور جس پر بڑی سرگرمی اور پابندی سے وہ عامل ہے اب اس نے مولانا کے خطبات شائع کرنے شروع کیے ہیں، یہ کتاب اس سلسلے کی پہلی جلد ہے جو پندرہ خطبات پر مشتمل ہے، اور ان میں تقریباً وہ سب خطبات جنھوں نے ایک زمانے میں پورے ملک میں مولانا کی خطابت کی دھوم مچا دی تھی، مثلاً مجلسِ خلافت آگرہ، جمعیت علماے ہند لاہور، انڈین نیشنل کانگریس، دلّی و رام گڑھ، عربی نصاب کمیٹی لکھنو، تقسیم کے فوراً بعد جامع مسجد دہلی کی تقریر، یہ سب خطبات آگئے ہیں۔ حسنِ ترتیب کے لیے فاضل مرتب کا نام سب سے بڑی ضمانت ہے، چنانچہ اعلے کتابت و طباعت اور کاغذ اور صحت کے اہتمام کے ساتھ۔ کتاب کے آخر میں آیات قرآنی، احادیث، اعلام، بلاد و اماکن، کتب و رسائل کی الگ الگ فہرستیں بھی ہیں، پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ مرتب نے ساٹھ صفحوں میں خطبات پر حواشی بھی لکھے ہیں اور آخر میں ان حواشی کے مآخذ کی فہرست بھی دی ہے، علمی اور ادبی حیثیت سے یہ بجائے خود نہایت مفید اور معلومات افزا کام ہے، جس پر ساہتیہ اکادمی اور جناب مالک رام صاحب دونوں مبارکباد کے مستحق ہیں۔

(برہان، مارچ ۱۹۷۵ء)

میرا عقیدہ :

مصنف : مولانا ابوالکلام آزاد۔

تقطیع : کلاں، ضخامت ۳۸ صفحات۔ کتابت وطباعت بہتر۔

قیمت : ایک روپیہ آٹھ آنے۔ پتا : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب ترجمان القرآن کی پہلی جلد جب شائع ہوئی ہے تو اس میں سورۂ فاتحہ کی تفسیر کی چند عبارتوں سے بعض حضرات کو یہ غلط فہمی ہوگئی تھی کہ مولانا نجات کے لیے صرف ایمان باللہ اور عملِ صالح کو کافی سمجھتے ہیں اس پر اس زمانے میں بہت شور وغل ہوا، اور متعدد اصحاب نے مقالات لکھے۔ مگر جیسا کہ مولانا کی عادت تھی، اخبارات میں تو اس سلسلے میں کچھ نہیں لکھا اور نہ اپنی صفائی پیش کی البتہ بعض دوستوں کے خطوط کے جوابات لکھے اور ان میں صاف صاف لکھ دیا کہ ان کا اس بارے میں عقیدہ کیا ہے۔ چنانچہ ایک مکتوب گرامی میں تحریر فرماتے ہیں :

"بہرحال آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ ایمان سے مقصود یہ ہے کہ اللہ پر، اللہ کے رسولوں پر، یوم آخرت پر، اور قرآن اور صاحب قرآن پر لائے اور عمل سے مقصود وہ اعمالِ صالحہ ہیں جنھیں قرآن نے اعمالِ صالحہ قرار دیا ہے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس تصریح کے بعد بات بالکل صاف ہو جاتی ہے اور یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مولانا کا عقیدہ وہی تھا جو ایک سچے مسلمان کا ہونا چاہیے۔ یہ مجموعہ مولانا کے اسی نوع کے چھ خطوط پر مشتمل ہے جو مختلف تاریخوں میں مختلف اصحاب کو لکھے گئے ہیں، ان خطوط میں خاص اس مسئلے کے علاوہ اور بھی چند علمی، تفسیری اور کلامی مسائل زیر گفتگو آ گئے ہیں۔ مجموعے میں دو طویل خطوں کے فوٹو بھی ہیں جن سے اس کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔ شروع میں قاضی سید احمد حسین صاحب ممبر پارلیمنٹ اور غلام رسول صاحب مہر جو خود مکتوب الیہ بھی ہیں، کے قلم سے ان خطوط کی تقریب و تعارف بھی ہے۔

(برہان، مئی ۱۹۶۰ء)

(ب)

افاداتِ آزاد :

مرتّب : ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری۔
تقطیع متوسط، ضخامت ۱۸۰ صفحات، کتابت و طباعت کاغذ اور گٹ اپ بہتر۔
قیمت : ۲۵ روپے - پتا : مکتبہ شاہد - علی گڑھ کالونی - کراچی ۴۱ -

اللہ تعالےٰ ارباب علم و ادب کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے، ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری کو کہ پاکستان میں رہ کر مولانا ابو الکلام آزاد پر ایسا مفید اور اہم کام مسلسل کر رہے ہیں جس کی توفیق ہمارے ملک میں آج تک کسی کو نہیں ہوئی، وہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر مولانا کا یا مولانا پر کسی لکھنے والے کا ایک ایک لفظ فراہم کر رہے ہیں اور اپنے فاضلانہ مقدمہ و تبصرہ اور حواشی کے ساتھ بہ کمالِ اہتمام شائع کر رہے ہیں، چنانچہ اب تک وہ مولانا پر متعدد بڑی مفید اور معلومات افزا کتابیں منظر عام پر لا چکے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب بھی اسی زنجیرِ طلائی کی ایک کڑی ہے، اس کتاب میں بڑی محنت اور تلاش و جستجو کے بعد فاضل مرتب نے مولانا کے ان ارشادات کو یک جا کر دیا ہے جو آپ نے مختلف حضرات کے دینی، علمی اور ادبی استفسارات کے جوابات میں فرمائے تھے اور ان کو خود آپ نے تحریر کیا تھا یا آپ کی جانب سے محمد اجمل خاں صاحب نے لکھا تھا۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے، ایک دینی اور دوسرا ادبی، حصہ اول میں ایمان و عقائد، عبادات، قرآن و حدیث اور متعدد مسائلِ فقہیہ مثلاً نکاح و طلاق اور چند جدید مسائل مثلاً زندگی کا بیمہ، سود، پروویڈنٹ فنڈ، رویتِ ہلال کی خبر بہ ذریعہ ریڈیو یا ٹیلی فون یا ٹیلی گرام وغیرہ اور فوٹو اور اسٹیچو۔

ان مسائل کے علاوہ بعض مسائلِ تصوف تعلیم و اصلاح اور رسوم مثلاً فاتحہ نذر و نیاز، یوم میلاد النبی اور سلام و قیام فی المیلاد، ان سب کے متعلق مولانا نے اظہار خیال فرمایا ہے جو بہت بصیرت افروز اور تشفی بخش ہے۔

دوسرا حصہ جو ادبی ہے اس میں مولانا نے ایک سو نواسی ۱۸۹ استفسارات کے جوابات

دیے ہیں جو مولانا کی وسعتِ علم اور ذوق ادبی پر دال ہے۔

بہ ہر حال اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ اس ایک کتاب کے مطالعے سے مولانا کے مذہبی عقائد و افکار اور ان کی ادبی معلومات اور علمی وسعتِ نظر کے متعلق جو معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ مولانا کے حالات و سوانح پر بڑی بڑی ضخیم کتابوں سے حاصل نہیں ہوتیں۔ ان جوابات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وسعتِ علم و نظر کے ساتھ ساتھ مولانا کا علم مستحضر تھا اس لیے بڑے سے بڑے علمی اور پیچیدہ سوال کا جواب وہ برجستہ اور فوراً دے دیا کرتے تھے۔

شروع میں فاضل مرتب ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری کے قلم سے دیباچہ ہے اس کے مطالعے سے اندازہ ہوگا کہ انھوں نے اس کتاب کی ترتیب میں کس درجے محنتِ شاقہ برداشت کی ہے۔ اس کے بعد مولانا کے پرائیویٹ سکریٹری محمد اجمل خاں مرحوم کا نوشتہ ایک مقدمہ ہے، امید ہے اربابِ ذوق اس کی قدر کریں گے۔

(برہان، اگست ۱۹۸۴ء)

قرآن کے بنیادی تصورات : (انگریزی)۔

مولّف : ڈاکٹر سید عبداللطیف۔

تقطیع متوسط، ضخامت : ۱۸۰ صفحات۔ ٹائپ جلی اور روشن۔

قیمت : چھ روپیہ پچاس نئے پیسے۔ پتا : اکادمی آف اسلامک اسٹڈیز۔ حیدرآباد دکن (انڈیا)

مولانا ابوالکلام آزادؒ نے ترجمان القرآن کی جلد اول میں سورۂ فاتحہ کی تفسیر جس خاص انداز میں لکھی ہے اور اس میں فلسفہ اور مذہب کے پیوند سے جو بصیرت افروز حقائق بیان کیے ہیں، ان کے عام افادہ کی غرض سے ضرورت تھی کہ ان کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا جاتا۔ اس کام کے لیے ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب جو انگریزی زبان کے نامور ادیب اور انشا پرداز ہیں، کے سوا اور کون زیادہ موزوں ہو سکتا تھا۔ چناں چہ جیسا کہ موصوف نے اس کتاب کے مقدمے میں ذکر کیا ہے، انھوں نے پوری سورۂ فاتحہ ہی کی تفسیر کا ترجمہ انگریزی میں کر ڈالا ہے جو عن قریب شائع ہوگا۔ اس کتاب میں انھوں نے اس تفسیر کے

چیدہ چیدہ چند مضامین کو اپنی زبان میں بیان کیا ہے۔ مضامین یہ ہیں، خدا کا قرآنی تصوّر، خدا کی صفتِ الوہیت، صفت رحم و ربوبیت، صفتِ عدل، وحدتِ وحیِ الٰہی، وحدتِ انسانی، ان مضامین کی بنیاد اور ان کا مغز مولانا ابوالکلام آزادؔ کی تحریر ہے لیکن الفاظ اور پیرایۂ بیان ڈاکٹر صاحب کے ہیں اور حق یہ ہے کہ انھوں نے ترجمہ کا حق ادا کر دیا ہے۔ جس سے مسلم اور غیر مسلم انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب کو فائدہ اٹھانا چاہیے۔ تاہم یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ مولانا ابوالکلام آزادؔ نے سورۃ فاتحہ کی تفسیر میں وحدتِ ادیان کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ اگرچہ بڑی حد تک درست ہے، لیکن مولانا نے اس بحث کے بعض گوشوں کو ناتمام چھوڑ دیا ہے اور اس بنا پر اس سے بعض مغالطے پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں لیکن اس قدر کہہ دینا بہرحال ضروری ہے کہ بلاشبہ تمام ادیان کی اصل ایک ہی ہے اور فرق جو کچھ ہے وہ شریعت اور منہاج کا ہے۔ لیکن دین ایک کلی طبعی ہے جس کا وجود بجائے خود کچھ نہیں۔ اُس کا تحقق ہمیشہ افراد کے ضمن میں ہوتا ہے اس بنا پر ایک شریعت کے بعد جب دوسری شریعت آتی ہے تو اب دین اسی شریعت کے اتباع اور پیروی میں منحصر اور محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ ورنہ اگر یہ بات نہ ہو تو لوگوں میں افتراق اور پراگندگی پیدا ہو جائے۔ حالاں کہ دین کا مقصد وحدت اور یک جہتی پیدا کرنا ہے۔ قرآن جو وحدتِ ادیان کا اعلان کرتا ہے اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ دین کا ظہور مختلف شریعتوں کی صورت میں ہوتا رہا اور چوں کہ دین کی اصل ایک ہے اس لیے اس کا تحقق جن جن مختلف شریعتوں کی شکل میں ہوا وہ سب شریعتیں اپنے اپنے عہد میں واجب الاتباع تھیں لیکن اب جب کہ شریعتِ محمدیؐ کا ظہور ہو گیا ہے دین کا انحصار اسی میں ہو گیا ہے یعنی ایمان باللہ اور عمل صالح جو اصل دین ہے اب وہی معتبر ہوگا جو تعلیماتِ محمدیؐ کے مطابق ہوگا۔ یہ ایک واضح بات ہے جو قرآن سے صاف ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن مولانا ابوالکلام آزادؔ نے وحدتِ ادیان کے مسئلے پر اس انداز سے گفتگو کی ہے کہ یہ حقیقت مشتبہ ہو گئی ہے اور افسوس ہے کہ ڈاکٹر صاحب بھی اس اشتباہ کا شکار ہو گئے ہیں۔ جیسا کہ کتاب کے باب پنجم کی بعض عبارتوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

(برہان، اگست ۱۹۵۹ء)

(ج)

ابوالکلام آزاد :

تقطیع متوسط، ضخامت ۲۴۳ صفحات، کتابت وطباعت اور کاغذ اعلیٰ۔
قیمت : دو روپیہ۔ پتا : پبلی کیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ۔
اولڈ سکریٹریٹ۔ دہلی۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات پر رسالہ آج کل دہلی نے جو خاص نمبر "آزاد نمبر" کے نام سے شائع کیا تھا وہ بہت مقبول ہوا۔ اور اس کی تمام کاپیاں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگئیں اب اسی نمبر کو کتابی صورت میں چھاپ دیا ہے۔ اور اس کا نام بھی بدل دیا ہے، اس سے فائدہ یہ ہوا کہ پڑھنے والوں کو سہولت ہوگی اور پھر مستقل ایک کتاب کی حیثیت سے یہ زیادہ پائدار اور دیرپا ہوگی۔ رسالہ آجکل کے آزاد نمبر پر برہان میں تبصرہ ہو چکا ہے۔

(برہان، جنوری ۱۹۶۰ء)

انوارِ ابوالکلام :

مرتّب : علی جواد زیدی صاحب۔
تقطیع متوسط۔ ضخامت ۲۰۱ صفحات، کتابت وطباعت و کاغذ اعلیٰ۔
پتا : ثقافتی سب کمیٹی جشنِ بہار کشمیر۔ سری نگر۔
قیمت : سات روپے۔

مئی ۵۸ء میں یعنی مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات کے دو ڈھائی مہینہ بعد ہی حکومت کشمیر کے زیرِ انتظام بڑے پیمانہ پر جشن بہار کشمیر سری نگر میں منایا گیا تھا، اس سلسلے میں مختلف قسم کی تفریحات و مشاغل کے ساتھ، سات روز تک "آزاد سیمینار" کے نام سے ایک بزم مباحثہ و مقالات بھی منعقد ہوتی رہی جس میں ملک کے متعدد ادیبوں مصنفوں اور اہل قلم نے حصہ لیا۔ اور مولانا سے متعلق تقریریں کیں اور مقالات پڑھے، یہ کتاب اس سیمینار کی مکمل کارروائی پر مشتمل ہے۔ چنانچہ اس میں مختلف اجلاسوں کے خطبہ ہائے صدارت اور پہلے اجلاس کے خطبہ ہائے افتتاح و استقبالیہ بھی ہیں جو ملک کے نامور حضرات

نے پڑھے اور وہ سب مقالات بھی ہیں جو ان اجلاسوں میں پڑھے گئے۔ مولانا مرحوم پر اب تک جو لٹریچر جمع ہو گیا ہے، یہ کتاب اس حیثیت سے اس پر ایک بڑا قیمتی اور قابل قدر اضافہ ہے کہ اس میں مولانا کی علمی۔ ادبی۔ صحافتی اور سیاسی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بھرپور تبصرہ کیا گیا ہے۔ خواجہ غلام السیدین، خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر سید محی الدین زور۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی اور علی جواد زیدی کے مقالات خاص طور پر معلومات افزا اور دل چسپ ہیں۔ یہ کتاب ادبی اور تاریخی دونوں حیثیتوں سے اہلِ ذوق کے مطالعے کے لائق ہے۔

(برہان، ستمبر ۱۹۶۰ء)

ذکرِ آزاد:

مصنف : مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی۔

تقطیع متوسط۔ ضخامت : ۴۷۶ صفحات، کتابت و طباعت بہتر۔

قیمت : مجلد سات روپیہ۔ پتا : دفتر آزاد ہند نمبر ۲۲/ا اے، ساگر دت لین، کلکتہ۔ ۱۲

مولانا ملیح آبادی کو مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ جو خصوصیت تھی اسے ہر شخص جانتا ہے، کم و بیش اڑتیس سال مولانا کی محبت و صحبت میں بے تکلفی کے ساتھ رہے اور اس طرح مولانا کو بہت قریب سے دیکھنے اور پرکھنے کا جو موقع اُن کو ملا کسی اور کو کہاں ملا ہوگا۔ چنانچہ یہ کتاب جیسا کہ مرحوم نے دیباچے میں خود تصریح کر دی ہے، مولانا کی سوانح حیات نہیں ہے اور نہ اُن کے کارناموں کی داستان ہے، بلکہ یہ صرف اس طویل رفاقت کی دل چسپ و دلآویز کہانی ہے جو مرحوم کو مولانا آزاد کے ساتھ رہی تھی۔ اگرچہ مولانا کے علم و فضل اور سیاسی فکر و تدبر کا تذکرہ بھی ضمناً آ گیا ہے، اور اس سلسلے میں بڑی بات یہ ہے کہ مولانا کی بعض خاص تحریریں جو اب تک طبع ہی نہیں ہوئی تھیں یا طبع ہو چکی تھیں مگر نایاب ہو گئی تھیں، اس کتاب میں محفوظ ہو گئی ہیں تاہم مولانا کی نجی زندگی جسے وہ عام طور پر پبلک کی نگاہوں سے بہت دور رکھتے تھے، اُن کے طبعی میلانات و رجحانات، اوصاف و اخلاق اور مذاق و

مزاج کتاب کا اصل موضوع ہیں اور اُس کی یہی وہ خصوصیت ہے جو اس کو اس سلسلے کی دوسری کتابوں سے ممتاز کرتی ہے۔ مرحوم مصنّف کا قلم بیباک نگاری کے لیے مشہور ہے۔ اس بنا پر اگرچہ مرحوم کو مولانا کے ساتھ جو عقیدت و ارادت اور محبت و اُلفت تھی، اُس کا رنگ کتاب کے ہر صفحے میں نمایاں ہے، تاہم مولانا کی نسبت وہ بعض باتیں ایسی بھی لکھ گئے ہیں جو مولانا کے غالی عقیدت مندوں کے لیے نئی اور شاید تکلیف دہ بھی ہوں مثلاً یہ کہ مولانا رانچی میں نظر بند ہونے تک کلین شیو رہتے تھے۔ انگریزی لباس بھی ایک زمانے میں استعمال کیا تھا۔ بالوں کی وضع انگریزی تھی۔ ہندوستانی عطر کے بجائے انگریزی سینٹ وغیرہ زیادہ مرغوب تھا، پھر یہ بھی کہ عربی بولنے پر قدرت نہیں تھی۔ ایک عرب سے صحبتیں رہیں تو "کسی قدر روانی سے بولنے لگے تھے" مولانا اگرچہ پبلک زندگی میں ہمیشہ بڑے سنجیدہ اور متین رہتے تھے، لیکن پرائیویٹ لائف میں بے حد ظریف الطبع، خوش مزاج اور خندہ جبیں تھے۔ یہ صرف ایک پہلو ہے۔ اس کے بالمقابل کتاب سے مولانا کے ذہنی، علمی، ادبی اور اخلاقی کمالات و اوصاف کا جو اندازہ ہوتا ہے وہ اُن کی شخصیت کی عظمت و بلندی کا یقین دلانے کے لیے کافی ہے۔ اس حیثیت سے کتاب بے حد دلچسپ بھی ہے اور پُر از معلومات بھی اور مولانا کا کوئی سوانح نگار اس سے مستغنی نہیں ہوسکتا۔ شگفتہ نگاری اور سادگیِ تحریر کے ساتھ پُرکاری کے لیے مصنف کا قلم خود ضمانت ہے۔ اس لیے ادبی حیثیت سے بھی مطالعے کے لائق ہے۔ البتہ مولانا مرحوم کے بعض معاصرین (ایک مرحوم اور ایک زندہ[1]) سے متعلق اس میں جو تلخ و درشت ریمارک ہے وہ موتیوں میں خزف ریزوں کی طرح ذوقِ جمال پر بارگراں ہے۔ اور ہمیں یقین ہے کہ اگر مولانا کی نظر سے بھی یہ سطریں گزرتیں تو وہ ہرگز انھیں پسند نہیں کرتے۔ اسی طرح مولانا کے حوالے سے مولانا شبلی کا جو واقعہ نقل کیا گیا ہے اُس کا اندراج بھی سخت نامناسب ہے۔ کمزوریاں کس میں نہیں ہوتیں؟ اور خود مولانا بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے لیکن وقائع نگاری کا یہ

---

[1] اشارہ حضرت سید سلیمان ندویؒ اور مولانا عبدالماجد دریابادی کی طرف ہے۔ اب دریابادی بھی مرحوم ہو گئے رحمہما اللہ تعالیٰ۔

فرض نہیں ہے کہ ہر کمزوری کا ذکر ضرور ہی کیا جائے، علی الخصوص علماء کی اس کمزوری کا جس سے عام لوگوں میں گمراہی کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔

(برہان، اگست ۱۹۶۰ء)

امام الہند (تعمیر افکار):

مصنف: جناب ابو سلمان الہندی۔

تقطیع: متوسط۔ کتابت و طباعت: متوسط درجہ کی۔ ضخامت: ۲۸۰ صفحات۔

قیمت: مجلد چھ روپے۔ پتا: مکتبہ اسلوب، کراچی ۔ ۱۸

مولانا ابو الکلام آزاد پر کتابیں شائع کرنے کی غرض سے کراچی میں ایک ادارہ "آزاد ریسرچ، انسٹی ٹیوٹ" کے نام سے قائم ہوا ہے۔ اور یہ پہلی کتاب ہے جو ادارہ کی طرف سے چھپی ہے۔ اس میں صرف مولانا کی ابتدائی زندگی کے حالات جس کے بعض گوشے یا تو زیادہ اُجاگر نہیں تھے یا تھے مگر بعض لوگوں نے اُن کو محلِ نظر یا مختلف فیہا بنا دیا تھا یعنی حسب و نسب خاندانی، تعلیم و تربیت، بہن بھائی، اساتذہ، شاعری، انشا پردازی اور انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کی تعلیم، عراق و مصر کا سفر وغیرہ سب سنجیدہ و متین اور شگفتہ انداز میں لکھے گئے ہیں جو کچھ لکھا ہے، مواد جمع کر کے کافی غور و خوض کے بعد لکھا ہے۔ استفادہ اپنے سب پیشروؤں سے کیا ہے مگر آنکھ بند کر کے کسی معاملے میں بھی کسی کی رائے قبول نہیں کی۔ خود مقدمات مرتب کر کے نتائج نکالے ہیں۔ مولانا کے مخالف سے مخالف کا بھی نام لیا ہے تو سنجیدگی اور شرافت کے ساتھ۔ غرض کہ مولانا پر اب تک جو کتابیں لکھی گئی ہیں اُن کے ذخیرے میں یہ کتاب ایک خوشگوار اور مفید اضافہ ہے۔

(برہان، نومبر ۱۹۶۳ء)

مولانا ابو الکلام آزاد:

مؤلف: جناب عابد رضا صاحب بیدار۔

تقطیع: کلاں۔ ضخامت: ۴۹۴ صفحات۔ کتابت و طباعت: بہتر۔

قیمت : مجلد ۲۰ روپے۔

مولانا سے متعلق انگریزی اور اُردو میں متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور مقالات کا تو کوئی شمار ہی نہیں۔ لیکن یہ کتاب سب سے نرالی اور اپنی سج دھج کی ایک ہی ہے۔ اس میں لائق مولف نے مولانا کی شخصیت، سوانح حیات، صحافت اور علمی و ادبی اور سیاسی کارناموں کی داستان خود مولانا کی زبان سے سنا کر مرحوم کی ایک ایسی جامع تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس میں چہرہ کی آب و تاب کے ساتھ اس کی جھائیاں اور داغ بھی آ گئے ہیں۔ مولانا کے عقیدت مندوں کو اس کتاب کے بعض حصوں سے سخت صدمہ ہوگا۔ اور یہ واضح رہے کہ مولف بھی عقیدت مند ہی ہیں ——— لیکن مؤرخ اور سوانح نگار کے قلم پر کون پابندی لگا سکتا ہے۔ بہرکیف اس میں شبہ نہیں کتاب بڑی محنت اور عرق ریزی سے مرتب کی گئی ہے، اور اس بنا پر اس میں ایسی متعدد مولانا کی تحریریں اور معلومات شامل ہیں جو کہیں اور کسی جگہ دستیاب نہیں ہو سکتیں۔ البتہ مصنف نے عجیب و غریب انداز میں کتاب کا "انتساب" لکھ کر اپنی حق گوئی اور راست پنداری کا وہ بھرم مجروح کر دیا ہے جو وہ مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق قائم کرنا چاہتے تھے۔

(برہان، ستمبر ۱۹۶۹ء)

ابوالکلام آزاد :

شاعر : جگن ناتھ آزاد :

ناشر : ادارۂ فروغِ اُردو، لکھنؤ۔

قیمت : پچیس ۲۵ نئے پیسے۔

جگن ناتھ آزاد ہمارے دَور کے نہایت ممتاز اور پختہ کلام شاعر ہیں، انھوں نے علامہ اقبال جیسے یگانۂ روزگار سے نہ صرف فیضِ صحبت اٹھایا ہے بلکہ ان کی خصوصیات بھی اپنے اندر سمولی ہیں، یہ بقولِ ڈاکٹر تاثیر مرحوم "جگن ناتھ کی وہی ادبی روایات ہیں جو غالب، اقبال، حسرت موہانی، جوش اور چکبست میں وجہ مشترک ہیں" تازگی اور سوز

و گداز کے ساتھ ان کے کلام میں ایک عجیب طرح کا ادبی توازن پایا جاتا ہے جس سے ان کے شاعرانہ کمالات کا اندازہ ہوتا ہے میں ان کا یہ شعر اکثر پڑھا کرتا ہوں :

عشق کے حضور میں سرخ رو تو ہو گئے — دامنِ حیات اگر تار تار ہے تو کیا

"ابوالکلام آزاد" ان کی تازہ ترین نظم ہے جو مولانا آزاد مرحوم کی وفات پر لکھی گئی ہے، نظم کا ایک ایک بند، اثر انگیزی اور جوشِ عقیدت میں ڈوبا ہوا ہے، دو بند ملاحظہ ہوں :

(۱) گرچہ اے دہلی! ترے دل میں دفینے ہیں بہت — تیرے ہر گوشے میں پوشیدہ خزینے ہیں بہت
تیری مٹی میں نہاں بے تاب سینے ہیں بہت — تو وہ دریا ہے کہ گم جس میں سفینے ہیں بہت
آج لیکن تجھ میں اک فخرِ زمن خوابیدہ ہے — پیکرِ صدق و صفا و علم و فن خوابیدہ ہے

(۲) جس کی ساری داستاں تھی داستانِ علم و فن — جس کی موجِ نطق سے آباد تھا اپنا چمن
جس کو کہیے آبروے شیخ و فخرِ برہمن — آج سوتا ہے تری مٹی میں وہ نازِ وطن
نور سے معمور اک ہیرا ترے دامن میں ہے — جس نے ظلمت کا جگر چیرا ترے دامن میں ہے

(برہان، اگست ۱۹۵۸ء)

مولانا آزاد اور ان کے ناقد :

مرتب : ایم۔ اے شاہد۔
تقطیع : متوسط۔ ضخامت : ۱۶۰ صفحات، کتابت و طباعت : بہتر۔
قیمت : /۲ روپے۔ پتا : ماڈرن پبلشرز، گول ایمپرس مارکیٹ، صدر کراچی۔

مولانا ابوالکلام آزاد برصغیر کی نہایت محترم اور باوقار شخصیت تھے، لیکن دنیا کے ہر بڑے انسان کی طرح مولانا جتنے بڑے تھے اتنے ہی وہ نکتہ چینوں اور مخالفوں کے ہدفِ طعن و تشنیع بنے، اور بعض مخالفوں نے تو اپنی کم ظرفی کا ثبوت اس طرح دیا کہ زبان کے ساتھ اپنا ذہن بھی بگاڑ لیا۔

مولانا پر جن اعتراضات کی بوچھار کی گئی ان کی نوعیت دو قسم کی ہے یعنی مولانا ...

ایک عالم دین کے اور مولانا بحیثیت ایک سیاسی لیڈر کے، لائق مرتب نے اس کتاب میں مولانا پر ان تنقیدوں کا جائزہ اس طرح لیا ہے ، کہ خود انھوں نے کچھ نہیں کہا بلکہ مولانا آزاد سے متعلق برصغیر کے اکابر علم وادب کی مطبوعہ تحریریں اور ان کے خطوط سے اقتباسات مع حوالوں کے یک جا کر دیے ہیں ۔ یہ اقتباسات گنتی میں ۳۶ میں جن میں سے تین ایڈیٹر برہان کے مقالات کے بھی ہیں، پھر مختلف اخبارات ورسائل نے مولانا کے دفاع اور ان پر اعتراضات کے جواب میں جو اداریے سپرد قلم کیے تھے ان کے اقتباسات الگ ہیں، علاوہ ازیں ثناء اللہ مجاہد صاحب نے ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری سے ایک انٹرویو کی شکل میں مولانا آزاد کے خلاف سازشوں کے تاریخی پس منظر پر بھی روشنی ڈالی ہے ۔ غرض کہ مولانا آزاد پر جو کتابیں شائع ہو چکی ہیں ان میں یہ کتاب ایک بڑا اچھا اور قابل قدر اضافہ ہے ۔

(برہان ، مئی ۱۹۸۱ء)

(د)

مقدمات و بیاناتِ اکابر :

مرتب : حافظ عبدالرشید ارشد ۔

تقطیع : متوسط ، ضخامت : ۴۶۴ صفحات ، کتابت وطباعت : بہتر ۔

قیمت : مجلد ۲۵ روپے ، پتا : مکتبۂ رشیدیہ لمیٹڈ لاہور ۔

تحریک خلافت و آزادیٔ وطن کے زمانے کا مشہور مقدمہ کراچی (۱۹۲۱ء) جس میں مولانا سید حسین احمد مدنی ، مولانا محمد علی ، شوکت علی اور تین اور مسلمان لیڈر ، حکومتِ وقت کی افواج میں بغاوت پھیلانے کے جرم میں ماخوذ تھے اور جس میں ان حضرات کو دو دو برس قید بامشقت کی سزا دی گئی تھی ، اس مقدمے میں مولانا سید حسین احمد مدنی اور مولانا محمد علی نے نہایت اہم اور ولولہ انگیز طویل اور مفصل بیانات دیے تھے ۔

اسی طرح ۱۹۲۲ء میں حکومتِ وقت کے خلاف نفرت و عداوت پھیلانے کے جرم میں جب مولانا ابوالکلام آزاد پر چیف پریذیڈنسی مجسٹریٹ کلکتہ کی عدالت میں مقدمہ چلا اور اس میں مولانا نے اپنا ایک طویل تحریری بیان "قولِ فیصل" کے نام سے داخلِ عدالت کیا تھا، درحقیقت یہ تینوں بیانات برصغیر کی جنگ آزادی کی تاریخ خونِ چکاں کے وہ روشن و تابناک ابواب ہیں جن کی تابانی مُرورِ ایام سے کم نہیں ہوسکتی۔

یہ بیانات تاریخ عالم میں انسانی حریت و آزادی، جمہوریت، شرف و مجدِ بنی نوع انسان اور اعلانِ حق و صداقت سے متعلق اسلام کی عالم گیر تعلیمات اور اس کی ابدی سچائیوں کی وہ اہم دستاویزات ہیں جن کو نہ صرف برصغیر کی آیندہ نسلیں افتخار و اعتبار کی نگاہ سے پڑھیں گی، بلکہ سقراط نے زہر کا پیالہ نوش کرتے ہوئے اور گلیلیو نے دار کا حکم سن کر جو کچھ کہا تھا اسی طرح یہ بیانات بھی حریت انسانی کے عالمی ادب میں ضرب المثل بن کر زندہ رہیں گے، پھر مولانا ابوالکلام آزاد کے حسن انشا اور زورِ بیان و خطابت نے تو اس مئے دوآتشہ کو سہ آتشہ بنا دیا اور اس کی تاثیر کو دوبالا کردیا تھا کہ پڑھتے جائیے اور جھومتے جائیے، یہ سب بیانات اور مقدمات کی تفصیلی روداد اُسی زمانے میں اخبارات میں اور کتابی صورت میں خوب خوب شائع ہوئے تھے اور ملک میں ان کا بڑا چرچا ہوا تھا۔ لیکن اب جب کہ آوازۂ منصور، دیرینہ و کہن ہوگیا ہے، نئی نسلوں میں ایمان و یقین کی حرارت پیدا کرنے کی غرض سے "حکایتِ دار و رسن" کو پھر سنانے کی ضرورت تھی، لائق مرتب قابلِ مبارک باد ہیں کہ انھوں نے اس طرف توجہ کی اور اس کتاب میں وہ سب بیانات، مقدمات کی پوری کارروائی اور عدالتوں کے فیصلوں اور اس سلسلے کی چند اور مفید معلومات کے ساتھ خوش سلیقگی سے شائع کر دیے ہیں، نئی نسل کو بزرگوں کے مجاہدانہ کارناموں سے باخبر کرنا اور ان کی یاد کو تازہ کرنا، ملک اور قوم کی بڑی خدمت ہے اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ لائق مرتب ایک منصوبہ کے ماتحت اس کام کو بڑی خوبی اور محنت سے انجام دے رہے ہیں۔ چناں چہ اب تک وہ ایک ضخیم کتاب "برصغیر کے بیس علماء" اور "الرشید" کے تین ضخیم خاص نمبر "دارالعلوم دیوبند نمبر"

کے نام سے شائع کر چکے ہیں۔ اور اب وہ مولانا آزاد کے الہلال کی مکمل جلدوں کو عکسی تصویر کے ذریعے عن قریب شائع کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ موصوف کی ان کوششوں کو خاطر خواہ کامیابی عطا فرمائے۔[1]

(برہان، مئی ۱۹۸۱ء)

ترجمہ قرآن مجید (انگریزی):

مترجم: ڈاکٹر سید عبداللطیف،

تقطیع: متوسط۔ ضخامت: ۵۸۰ صفحات۔ ٹائپ روشن۔

قیمت: مجلد /۳۰ روپے۔ پتا: اکیڈمی آف اسلامک اسٹڈیز، حیدر آباد دکن۔

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت برِصغیر ہند و پاک کے علمی اور اسلامی حلقوں میں کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ موصوف ایک عرصے تک عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد (دکن) میں انگریزی زبان و ادبیات کے پروفیسر اور صدر شعبہ رہے ہیں۔ اس خدمت سے سبک دوش ہونے کے بعد آپ اسلامیات کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو گئے۔ چناں چہ اس سلسلے میں متعدد قابلِ قدر کتابیں آپ کے قلم سے نکل چکی ہیں۔ اب یہ آخری کارنامہ قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ ہے جو دوسری مشغولیتوں کے ساتھ بیس برس کی مدت میں تکمیل کو پہنچا ہے۔

اس کا آغاز دراصل مولانا ابوالکلام آزاد کی فرمایش اور خواہش پر ان کے ترجمان القرآن کے ترجمے سے ہوا تھا جو چھپ کر الگ سے شائع بھی ہو چکا ہے۔ لیکن ترجمان صرف اٹھارہ پاروں پر مشتمل تھا۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب نے مزید بارہ پاروں کا ترجمہ کر کے اسے مکمل کر دیا۔ اور اسے ایک ہی جلد میں شائع کر دیا ہے۔ آغاز چوں کہ مولانا کی فرمایش اور خواہش سے ہوا تھا اس بنا پر انگریزی میں اس کا انداز بعینہ وہی ہے جو اردو میں ترجمان القرآن کا ہے۔ (اور یہی انداز مولوی نذیر احمد دہلوی کے ترجمے کا بھی ہے)

---

[1] الہلال کی ابتدائی پانچ جلدیں (۱۹۱۲ء — ۱۹۱۴ء) منصوبے کے مطابق شائع ہو گئی ہیں۔

یعنی ترجمہ لفظ بلفظ یا جملہ بجملہ نہیں ہے جس سے مطلب اور مراد کے سمجھنے میں دشواری ہوتی ہوتی ہے۔ بلکہ قرآن مجید کی ایک یا زیادہ آیتوں میں جو ایک بات کہی گئی ہے اس کو محاورہ اور زبان کی رعایت کے ساتھ انگریزی میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ زبان کی شگفتگی اور اس کی فصاحت و بلاغت کا کیا کہنا! پروفیسر آربیری کے بعد اس معیار کا ہم نے یہ دوسرا ترجمہ دیکھا ہے۔ اور اس لیے امید ہے کہ انگریزی دانوں میں یہ کافی مقبول ہو گا۔

شروع میں ۳۶ صفحات کا ایک طویل مقدمہ بھی ہے جس میں قرآن مجید کی بنیادی تعلیمات اور علم کلام کے بعض مسائل پر گفتگو کی گئی ہے۔ لیکن غالباً ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر آج کل کے اعلیٰ تعلیم یافتہ غیر مسلموں کو قرآن اور اسلام سے قریب لانا رہا ہے۔ اور اس کے علاوہ ان پر تصوّف کا غلبہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ اس بنا پر انھوں نے اوّلاً عبادات کا ذکر بہت سرسری کیا ہے۔ اور ثانیاً بعض مسائل کی تشریح اس انداز میں کی ہے کہ علما کا ایک بڑا طبقہ اس سے اتفاق نہیں کر سکتا، یا کم از کم اس پر مطمئن نہیں ہو سکتا۔ مثلاً وحدتِ ادیان کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے گویا ترجمان القرآن کے اس حصّے ہی کو انگریزی کا جامہ پہنا دیا ہے۔ اور خود مولانا ابو الکلام آزاد نے اپنے بعض خطوط میں جو چھپ بھی گئے ہیں، اس سلسلے میں بہ طورِ تشریح و توضیح جو کچھ لکھا تھا، اسے نظر انداز کر گئے ہیں۔ اسی طرح شرک اور مشرک کے بارے میں (ص ۳۰) جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ شرک سیاسی بغاوت ہی کا نام ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے اس خیال سے زیادہ لائقِ توجہ تو وہ ہے جو علامہ سید رشید رضا نے تفسیر المنار میں آیت وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ کے ماتحت لکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت چوں کہ تمام دنیا کی طرف ہے اس لیے سب انسان آپ کی امت ہیں۔ البتہ امّت کی دو قسمیں ہیں ایک امتِ اجابت اور دوسری امتِ دعوت۔ مسلمان پہلی قسم میں داخل ہیں اور غیر مسلم دوسری قسم میں۔ اس بنا پر اب دنیا میں کوئی مشرک ہی

نہیں ہے۔ اور قرآن میں جن کو مشرکین کہا گیا ہے، ان سے مراد صرف مکہ کے لوگ ہیں۔ واللہ اعلم۔ بہرحال اس نوع کے چند مباحث سے قطع نظر ترجمے کا یہ مقدمہ بھی مفید اور لائق مطالعہ ہے۔

(برہان، نومبر ۱۹۶۹ء)

مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم